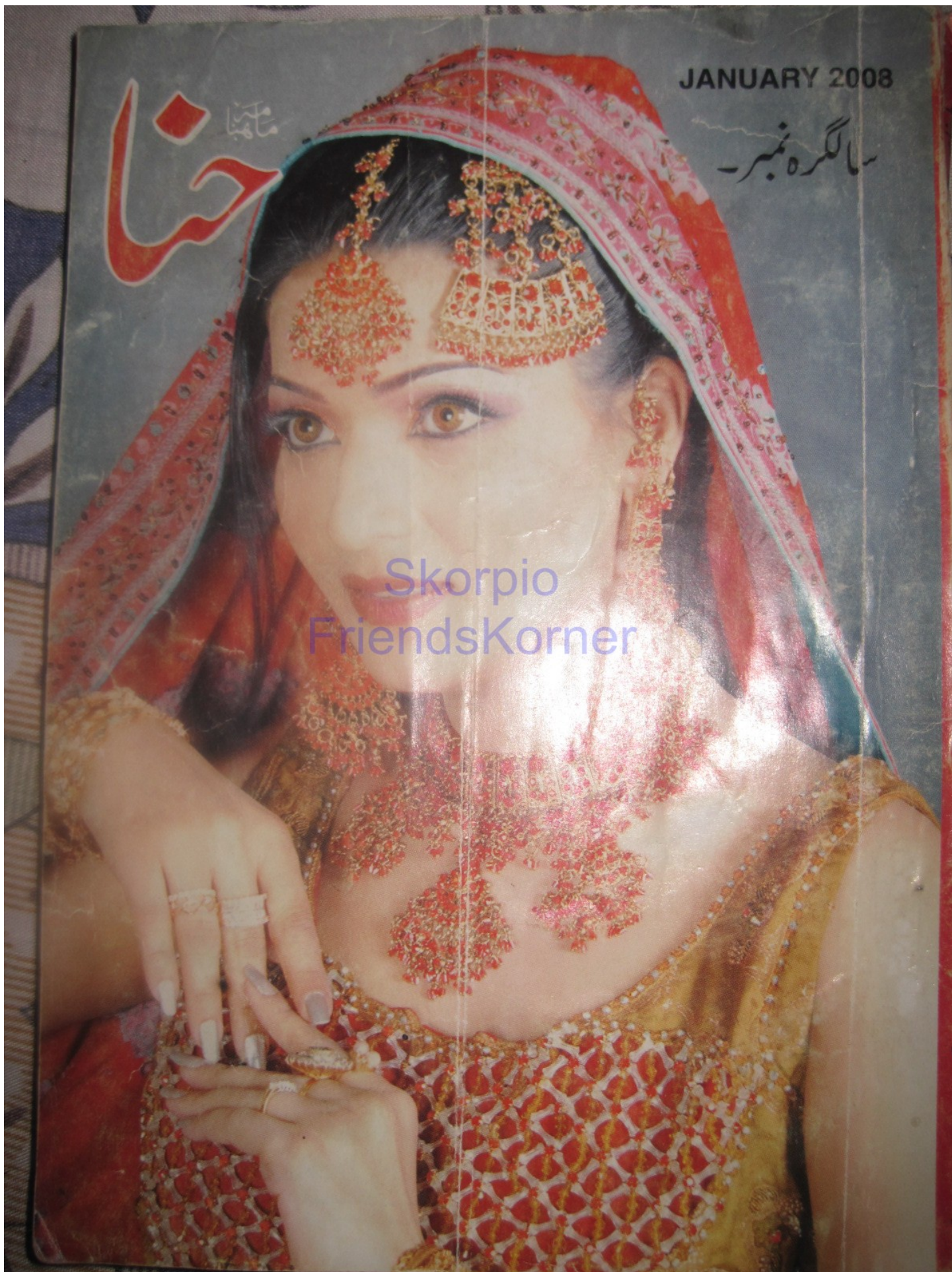


ماہنامہ  
حشا

JANUARY 2008

سہ ماہی نمبر۔

Skorpio  
FriendsKorner







Skorpio  
FriendsKorner



اماں کی زوردار چیخ ان کو اندر تک ہلا گئی۔ وہ دونوں بھاگ کر کمرے سے نکلیں تو اماں کے بالوں کو ابا کی گرفت میں دیکھ کر ان کے حلق سے جھنجھٹ نکلی گئیں۔

”ابا! چھوڑیں اماں کو۔“

”ہٹ پرے۔“ انہوں نے اسے بھی دھکا دے کر پیچھے پھینک دیا۔

”جو اس کرتی ہے، جھوٹ بولتی ہے مجھ سے، نکال کہاں ہیں پیسے، چل دے مجھے۔“

”ابا! چھوڑیں اماں کو، آپ کو پیسے چاہئیں ناں میں دیتی ہوں آپ کو پیسے۔“ اس کے چلانے پر ابا نے جھٹکے سے اماں کے بال چھوڑے تو وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگیں سردیوار کے ساتھ لگنے کے باوجود انہوں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

”نہیں ایک پیسہ نہ دینا اس کو، حرام کی کمائی نہیں ہے ہماری، خون پسینہ ایک کرتے ہیں دن رات۔“

لیکن وہ سنی ان سنی کرتی کمرے کی طرف بڑھ گئی ابا بھی اس کے پیچھے لپکا جب کہ راحیلہ نے اماں کو دونوں شانوں سے تھام کر چارپائی پر بیٹھا کر پانی کا گلاس ان کے منہ سے لگایا۔ اس نے ابھی بیگ سے پیسے نکالے ہی تھے کہ ابا نے فوراً جھپٹ لئے۔

”ابا! پلیز سارے نہیں۔“

لیکن اس نے بھی میں دبوچے ہوئے پیسوں کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر بغور اس کا جائزہ لیا۔

”ہوں، کمائی کرنے لگی ہے، بہت کمائی کرنے لگی تو۔“ وہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور پھر کمرے سے نکلتے چلے گئے۔ اس نے گہرے دکھ اور تاسف سے جاتے ہوئے باپ کو دیکھا۔

باہر سے اماں کی تیز آواز کانوں سے ٹکرائی۔

”کینے آوارہ انسان اب کبھی ادھر کا رخ

مت کرنا، اللہ کرے تو مر جائے، مرتا بھی نہیں مر دود۔“ اماں کی بددعاؤں پر وہ تڑپ کر باہر نکلی۔

”ایسے تو نا کہیں اماں آخر باپ ہے ہمارا۔“

”باب؟ ایسے ہوتے ہیں باپ، ساری عمر بیٹیوں کی شکل نہیں دیکھی ان کی وجہ سے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا اور اب نشہ پورا کرنے کے لئے ان کی کمائی کھانے آگیا ہے۔ پتہ نہیں کس نے اس بدذات کو خبر کر دی۔ بابا کے مرنے کی، ان کی جگہ اسے موت آ جاتی تو زندگی کے چار دن سکون سے گزر جاتے۔“ وہ دوپٹے کے پلو میں منہ چھپا کر رونے لگیں دونوں بہنوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

”جب تک بابا زندہ تھے ہمت نہیں ہوئی اس کی ادھر کا رخ کرنے کی اور اب زندگی عذاب بنا دی ہے اس نے ہماری، ہم تو خود فاقوں سے مر رہے ہیں اب کانشہ کہاں سے پورا کریں، سارے ہی لے گیا یا کچھ چھوڑے بھی مر دود نے؟“

”نہیں سب ہی چھپیں لئے۔“ اس کی ہلکی سی آواز نکلی تو وہ سر تھام کر رہ گئیں۔

”ہائے بابا!“

”کیسی بد قسمت ہیں تیری بیٹیاں ایک کو تو اپنی زندگی میں ہی جیتے جی مار گیا اور دوسری تیرے مرنے کے بعد مر کر جی رہی ہے۔“

”ہائے ری نصیبوں جلی کہاں ہے تو، کیسی بے خبر ہے تو یہ بھی نہیں جانتی کے ہمیں انگلی پکڑ کے چلانے والا اب اس دنیا میں نہیں رہا کیسے سندیس بھیجوں تجھے، تو نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔“

”بس کریں اماں!“ ان کی آواز جب بین کا روپ دھار گئی تو راحیلہ نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”نانا کو اس دنیا سے گئے چھ مہینے ہو گئے ہیں اماں، اب تو آپ کو صبر آ جانا چاہیے۔“

”ہائے کیسے صبر آئے مجھے۔“



”اپنی پسند سے شادی کرنے کا حق تو ہر انسان کو ہوتا ہے ماما! پھر آپ کے گھر والوں نے اسے قبول کیوں نہیں کیا ماما!“ اس کے سوال پر انہوں نے خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ یہاں موجود ہوتے ہوئے بھی کہیں اور پہنچ گئیں تھیں اس لئے کھوئے کھوئے انداز میں گویا ہوئیں۔

”میرا تعلق ٹڈل گلاس سے بھی کچھ نیچے ہی کے طبقے سے تھا۔ بابا ایک روایتی ان پڑھ باپ تھے جن کا کل سرمایہ ہی عزت و غیرت ہوتی ہے۔ ہماری اپنی پسند کا تو تصور بھی گناہ تھا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا، اوڑھنا، پہننا سب کچھ ماں باپ کی پسند پر ہوتا تھا۔ ہمارے بابا تو ہمارے طبقے سے تعلق رکھنے والے باقی مردوں کی نسبت تھوڑے سے روشن خیال تھے۔ جبھی تو انہوں نے ہمیں اسکول داخل کروایا تھا۔ بیٹا تو کوئی تھا نہیں کہ جس سے امیدیں وابستہ کرے اور میں گورنمنٹ پائی اسکول سے نکل کر جب کالج پہنچی تو دنیا ہی نئی تھی اور اس رنگ و بو کی دنیا میں ایسی کھوئی کہ باپ کی عزت کا خیال بھی نہ رہا۔“ بولتے بولتے آنسوؤں کی روانی سے آن کا گلا رندھنے لگا تو وہ خاموش ہو گئیں۔

”ماما! ایک بار آپ وہاں جائیں تو سہی، اتنے برسوں بعد آپ کو دیکھ کر ہو سکتا ہے وہ آپ کا نا کردہ گناہ معاف کر دیں۔“

”ایک بار نہیں میں تو بار بار گئی تھی وہاں، لیکن ہر بار یا تو دھکے دے کر نکال دی گئی یا پھر دروازہ ہی نہ کھلا۔“ ان کی بات پر وہ لب کاٹ کر رہ گیا۔

”یہاں تک کہ میری ماں جب اس دنیا سے رخصت ہوئی تو مجھے خبر ہی نہ کی۔ مجھے تو پتہ اس وقت چلا جب وہ منوں مٹی کے ڈھیر تلے سو چکی تھی۔ اس وقت بھی میرے باپ نے میری ایک نہ سنی کہ وہ مجھے ہی اپنی ماں کی قاتل سمجھتے

”صبر تو دکھ بانٹنے سے ہی ملتا ہے اور میرے درد کو سمجھنے والی تو ابھی تک اس درد سے نا آشنا ہے تو مجھے صبر کیسے آئے۔“

”اماں! کاش ہم آپ کا دکھ بانٹ سکتیں۔“

اس نے خاموش نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور دل میں گہرا ملال لئے وہاں سے اٹھ گئی۔

وال گلاس کے پاس رکھی چیئر پر براجمان شخصیت کے چہرے پر دنیا جہان کے کرب کے آثار نمایاں تھے۔ بند آنکھوں سے نکلنے والے آنسو لکیر کی صورت بالوں میں جذب ہو رہے تھے نجانے کتنا وقت گزر گیا تھا اپنی اسی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے۔ وہ اپنے جذبات کی رورٹس میں پھنس کر اپنے ارد گرد سے اس قدر بیگانہ ہو گئیں تھیں کہ انہیں احساس بھی نہ ہوا کہ وہ جو کافی دیر سے انہیں اس طرح بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ اب ان کے قدموں میں آن بیٹھا تھا۔

”ماما! ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اس نے پکارا تو وہ چونک کر سیدھی ہو گئیں۔“

”کیا بات ہے ماما! آج پھر اداس ہیں۔“

اس نے بہت نرمی سے پوچھا تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

”اداس، اداس تو بہت چھوٹا لفظ ہے بیٹا!“

انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھریں۔

”ماما! تو پھر آپ انہیں ڈھونڈ لیں ناں۔“

اس نے امید دلائی۔

”انہیں تو میں نے خود کھویا ہے بیٹا!“ ان کی آواز میں گہرا دکھ پنہاں تھا، اس کا دل کٹ گیا۔

”آپ نے کوئی گناہ تو نہیں کیا تھا ماما!“

اس کے کہنے پر وہ استہزائیہ سا مسکرایا۔

”بیٹی چاہے جس طبقے سے بھی تعلق رکھتی ہو گھر سے بھاگ کر باپ کا سر جھکانے والی لڑکی کو یہ معاشرہ بھی معاف نہیں کرتا بیٹا!“

تا بھی نہیں  
پ کر باہر

ہے ہمارا۔“  
ساری عمر  
سے دھکے  
پورا کرنے  
پتہ نہیں  
کے مرنے  
زندگی کے  
وہ پٹے کے  
بہنوں نے  
دیکھا۔

س ہوئی اس  
عذاب بنا  
وں سے مر  
س، سارے  
پ۔“

س کی ہلکی

ایک کو تو  
دوسری

۔“

تو، کیسی

انگلی پکڑ

رہا کیسے

نہ لی۔“

جب بین

سوصاف

ہ دیا۔

نے ہو گئے



تھے جو کہ میرے ہی غم میں چل بسی تھی۔ انہوں نے مجھے دھکے مار مار کر گھر سے باہر نکال دیا اور تمہارے پاپا کی بے عزتی الگ کی۔“

”تو پھر بھی، پھر بھی ماما! آپ ان ظالم اور بے حس لوگوں سے ملنے کے لئے ترستی ہیں۔“ وہ ایک دم ہی اشتعال میں آگیا۔ اپنی اتنی ناس ماما پر ایسے ظلم کا تصور ہی ان کے لئے سوہان روح تھا۔

”اچھا ہوا آپ ان لوگوں کو چھوڑ آئیں وہ تو آپ کے قابل ہی نہیں تھے۔ کیا نہیں دیا پاپا نے آپ کو۔“

”عزت، دولت، شہرت، بہت آئیڈل زندگی گزاری ہے آپ بھول جائیں ایسے ظالم لوگوں کو۔“

”کیسے بھول جاؤں بیٹا! وہ جیسے بھی تھے میرے اپنے تھے میرا اپنا خون۔ اتنا طویل عرصہ تو ان کو بھلائے رکھا لیکن اب سہا نہیں جاتا۔ کیسے بتاؤں کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھرتا جاتا ہے جب تک ملک سے باہر رہی حوصلے میں رہی لیکن اب قریب آ کر دوریاں سہی نہیں جاتیں، یہ سچ ہے کہ تمہارے پاپا نے میرے اعتماد کو دھوکا نہیں دیا۔ محبت اور عزت کے ساتھ ساتھ اور بھی سب کچھ دیا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے تمہارے باپ جیسا شریک حیات ملا۔ انہوں نے میرے ہر غم کو دامن پھیلا کر سمیٹ لیا۔ اس لحاظ سے میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی ہوں کہ زندگی کے اس سفر میں جب بھی دکھوں کے انبار تلے دب کر رہ جاتی وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے لئے پھولوں اور خوشیوں بھری راہ پر چل دیتے۔ ورنہ تو گھر سے بھاگ جانے والی اکثر لڑکیوں کا ٹھکانہ کوئی نہیں ہوتا۔“

”لیکن، لیکن بیٹا! زندگی میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب اپنے پچھڑے ہوئے یاد آتے اور ان کے بغیر جینا مشکل گیا۔ زندگی میں سب

کچھ مل جاتا ہے بیٹا! لیکن ماما باپ بہن بھائی دوبارہ نہیں ملتے اس لئے میں انہیں کھو کر بھی کھوتا نہیں چاہتی لیکن خود ہی ہمت بھی نہیں پاتی۔“ ان کی دھیمی آواز کے بھرتے سروں میں بھی جدائیوں کے عذاب گونج رہے تھے اور وہ انہیں اس عذاب سے نجات دلانے کا مصمم ارادہ کرتا وہاں سے اٹھ گیا۔

گھر میں قدم رکھتے ہی اسے نمایاں تبدیلی کا احساس ہوا۔ فضا میں بریانی اور فورے کی دھیمی سی خوشبو نے اسے اندر تک چونکا دیا تھا۔ حیرانی سمیت اس نے کمرے میں قدم رکھا۔

”السلام و علیکم!“ کمرے میں موجود دو نفوس نے باری باری اس کے سلام کا جواب دیا۔

”کیا بات ہے خیریت، کون آیا ہے؟“ اس نے متعجب اور سوالیہ انداز لئے ہوئے دونوں کی طرف دیکھا۔ راحیلہ آیا کے چہرے پر بکھرے گلابی گلابی رنگ اور اماں کا متفکر چہرہ کسی اور ہی بات کی غمازی کر رہا تھا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

”تم بیٹھو میں تمہارے لئے پانی لاتی ہوں۔“ آیا یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اماں نے جانی ہوئی بیٹی پر نظریں جما کر گہری سانس لی۔

”کیا ہوا اماں؟“ وہ جلد از جلد معاملے کی تہہ تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔

”تم کپڑے بدل کر تھوڑا آرام کر لو پھر بتاتی ہوں۔“

”نہیں اماں میں ٹھیک ہوں آپ کہیں۔“ وہ قدرے ریلیکس انداز میں چار پائی پران کے قریب بیٹھتی ہوئی بولی۔

”شہزاد کی ماں آئی تھی اپنی بیٹی اور داماد کو ساتھ لے کر۔“ انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

”پھر؟“

”پھر کیا شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں“



صاف کر رہی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

”آپا پلیز ایسے تو نہ روئیں اور اللہ پر یقین رکھیں وہ ہماری خوشیوں کے محل کو کبھی مسمار نہیں ہونے دے گا۔“

”تیرے جیسا حوصلہ کہاں سے لاؤں۔ ان تلخ حقیقتوں کے گھونٹ بھرتے بھرتے صبر کا پیانا لبریز ہو گیا ہے اب تو۔“ وہ صبح سے حقائق سے نظریں چراتے اپنے آپ میں ملن نجانے خوابوں کے گتے محل تعمیر کر چکی تھیں لیکن تمام پردے چاک ہوتے ہی اس کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

اماں کے اصرار اور دن رات کی پریشان سوچوں نے اسے سست سا کر دیا تھا۔

”کیا بات ہے میں چند دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ زیادہ ہی پریشان ہو۔“ آفس کے آف کے بعد وہ دونوں بھی سب کے ساتھ ہی باہر نکلیں تھیں اور اب فٹ پاتھ پر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ساجدہ نے اسے مخاطب کیا۔

”کچھ نہیں بس یونہی۔“ اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

”تم بتانا نہ چاہو تو یہ اور بات ہے لیکن کم از کم جھوٹ تو مت بولو۔ میں جانتی ہوں کہ ہنسنا بولنا تو تمہیں ویسے ہی نہیں آتا لیکن پچھلے کچھ دنوں سے ایک جامد خاموشی ہے جو تمہارے وجود کا مسلسل احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کیا اپنی پراہم تم مجھ سے شیر نہیں کرو گی؟“ اس نے رسان سے پوچھا اور دوبارہ گویا ہوئی۔

”میں جانتی ہوں کہ میں تمہارا کوئی بھی مسئلہ حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی لیکن کہہ سن لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور کیا پچھلے چار ماہ سے ہماری دوستی ایسی نہیں ہو سکی کہ تم مجھ پر اعتماد کر سکو۔“ ساجدہ نے بہت رسانیت سے اس کی

لوگ راحیلہ کی ساس کہتی ہے بیٹی بیاہ کر اکیلی ہو گئی ہوں پانچ جوان بیٹوں کی ماں ہوں اب اکیلے گھر نہیں سنبھلتا بڑے کو بیاہوں کی تو پھر چھوٹوں کی باری آئے گی ناں۔“

”لیکن اماں وہ ہمارے حالات سے بے خبر تو نہیں ہیں۔ اتنی جلدی ہم یہ سب کیسے کر سکتے ہیں۔ سچ تان کر تو دو وقت کی روٹی پوری کر رہے ہیں تو پھر شادی جیسا معاملہ کیسے نمٹائیں گے۔“ وہ خاصے متفکر اور الجھے ہوئے لہجے میں آہستہ آواز میں بولی۔ اماں اس کی بات پر چند لمحے خاموش رہ گئیں۔

”تو کوئی بہتر نوکری نہیں ڈھونڈ لیتی ڈھائی تین ہزار میں کب تک گزارہ ہو گا ہمارا۔“ اماں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”اماں کہاں ملتی ہیں نوکریاں، بڑی مشکل سے یہ نوکری ملی ہے۔ اچھا ماحول ہے اچھے لوگ ہیں ورنہ تو بانی ہر جگہ..... بہر حال اماں عزت سے پیاری کوئی چیز نہیں، یہ بھی ساجدہ کی مہربانی ہے جس نے اتنا بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔“

”میں جانتی ہوں، مگر اچھے رشتے بھی کہاں ملتے ہیں یہ تو ہمارے لئے بہت بڑی نعمت ہے کہ بابا اپنی زندگی میں ہی راحیلہ کا رشتہ طے کر گئے ورنہ اب کون آتا یہاں پر اور پھر اسے بیاہ کر تمہارے لئے بھی تو سوچنا ہے مجھے۔“

”ابھی آپ میری فکر چھوڑیں اور جو سامنے ہے اس کا سوچیں۔“

”کیا سوچوں؟ تمہارا باپ کسی قابل ہوتا تو آج اپنی دونوں بیٹیوں کو عزت کے ساتھ رخصت کرتی۔“ ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”حوصلہ رکھیں اماں، اللہ بہت کار ساز ہے وہ یقیناً کوئی نہ کوئی رہا نکال دیتا۔“

”انشا اللہ۔“ کہتے ہوئے انہوں نے آنسو پونچھے۔ اس نے گہری سانس لے کر گردن موڑی تو دروازے میں کھڑی راحیلہ بھی اپنے آنسو



طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے ساجدہ! تم جانتی ہو کہ ہمارے طبقے کے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ صرف پیسہ ہے۔“

”وہ تو ازل سے ہے اور میرا خیال ہے کہ ابد تک رہے گا۔ کوئی نئی بات کرو، اب تک تو ہمیں اس کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔“

”تمہارے لئے یہ نئی بات نہیں ہے کہ تمہارے گھر کمانے والے موجود ہیں تم صرف اپنی ضرورتوں کے لئے جاب کر رہی ہو جب کہ میرے لئے ہر نیا دن ایک امتحان ہے اور مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں اس امتحان سے کس طرح سرخرو ہو کر نکلوں۔“ اور پھر وہ دھیرے دھیرے سب کچھ اسے بتانے لگی کہ جن سوچوں نے اس کی راتوں کی نیند اڑا رکھی تھی سب کچھ سننے کے بعد وہ بھی کئی لمحے کچھ بول نہ سکی اور جب گویا ہوئی تو اس کا انداز کچھ سوچتا ہوا سا تھا۔

”ایسا کرو، تم آفس سے لون لے لو۔“

”لون؟ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے کہ یہ کمپنی روز میں شامل نہیں ہے۔“

”ہاں ہے تو نہیں لیکن بات کرنے میں کیا حرج ہے۔“

”ہونہ۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”کس سے بات کریں گے ہم تیسرے درجے کے ملازم کون ہماری سفارش کرے گا۔“ وہ بخ ہوئی۔

”ارے نہیں، کمپنی کے ایم ڈی کی جو اسٹنٹ ہیں ناں وہ بہت اچھی ہیں۔ پروٹیکشن طور پر ہی سہی لیکن ہم جیسوں کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ میں کل ہی سمجھیں ان سے ملواؤں گی۔“

”اچھا چلو ٹھیک ہے تمہارے کہنے پر بات کر لیتے ہیں ورنہ مجھے ان بڑے لوگوں سے کچھ اچھی امید نہیں ہے۔“

اور اگلے ہی دن وہ تھرڈ فلور پر موجود آفیسرز

ڈیپارٹمنٹ میں کھڑی ریسپشن سے ”مسز حنا خان“ کی موجودگی کی تصدیق کر رہی تھیں۔ اس نے انٹرکام ریسورکان سے لگایا اور دوسری طرف کی بات سن کر دوبارہ متوجہ ہوئی۔

”جی وہ ابھی بڑی ہیں آپ ٹن مینٹس ویٹ کریں پلیز۔“ لڑکی نے پروٹیکشنل انداز میں مسکرا کر انہیں کہا تو وہ سائیڈ پر رکھے صوفوں کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ آج پہلی بار اس طرف آئی تھیں بہت شاندار ڈیپارٹمنٹ تھا۔ طویل رایداری سے دونوں اطراف کمروں کی ایک لمبی قطار تھی اور ہر دروازے پر اندر بیٹھنے والے کا نام اور اس کے عہدے کی کاپی لگی تھی۔ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ بار بار اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی لڑکی نے مسکرا کر ان کی جانب دیکھا اور ایک سائیڈ پر رکھے سٹول پر بیٹھے چونکدار کو اشارہ کیا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور چند ہی منٹ بعد کولڈ ڈرنکس لائبریری کے سامنے رہ دیں۔ جن کے ختم ہوتے ہی ریسپشن نے انہیں جانے کا اشارہ کیا۔

ایم ڈی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کا دل سوکھے پتے کی مانند لرزا تھا۔ ساجدہ نے اس کی گھبراہٹ محسوس کر کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”مے آئی کم ان میڈم!“

”لیس۔“ نسوانی شائستہ آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں ان کے سامنے جا پہنچی۔

”سیٹ ڈاؤن پلیز۔“ انہوں نے چیئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جب کہ ان کے ہونٹوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ تھی۔ حقیقتاً ان کی عمر کوئی چالیس پینتالیس کے درمیان تو ضرور ہو گی لیکن گلے میں چھوٹا سا دوپٹہ ڈالے خوبصورت و پرتش چہرے پر بیچرل سامیک اب کیسے شوڈر کٹ بالوں کے ساتھ جدید تراش خراش کا



لباس زیب تن کئے وہ اٹھائیس، انیس سے زیادہ  
کی ہرگز نہ لگتی تھیں۔  
”جی کہیے۔“

”وہ میڈم! ہمیں آپ سے ریکوسٹ کرنا  
تھی۔“ ساجدہ کچھ نے تلے انداز میں گویا ہوئی۔  
”ہاں، ہاں کہیئے۔“ وہ پوری طرح متوجہ  
تھیں۔

”میڈم! یہ میری دوست ہے ”ریمل افشار  
زیدی“ تقریباً چار ماہ سے یہ یہاں میرے ساتھ  
جا رہی ہیں۔“ اس کے تعارف کروانے پر  
انہوں نے اس کے ساتھ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح  
بیٹھی لڑکی کو دیکھا جو بار بار اپنے ہاتھ آپس میں  
رگڑ رہی تھی۔

”ہوں، اچھا پھر؟“

”میڈم! ان کے ساتھ ایک پرابلم ہے؟“

”جسٹ اے منٹ۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا  
کر ساجدہ کو روکا۔

”جی مس ریمل! آپ کہیے کیا پرابلم ہے  
آپ کے ساتھ۔“ انہوں نے اس کے ہوائیاں  
اڑاتے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا کیونکہ اس کی حد  
سے بڑھی ہوئی گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے وہ خود  
بھی پریشان ہو گئیں تھیں۔ اس کا سادہ لیکن  
پرسش چہرہ کسی اور ہی بات کا غماز تھا۔ انہوں  
نے اس آپس کو ایک اچھا ماحول رہنے کے لئے  
بہت محنت کی تھی تا کہ ضرورت مند اور مجبور لڑکیوں  
کو یہاں کسی طرح کی کوئی پریشانی نہ ہو اور آج  
تک انہیں کوئی کمپلین نہیں ملی تھی۔ لیکن اب اسے  
دیکھ کر لگتا تھا کہ ایسی انہونی اس کے ساتھ ہو گئی  
ہے اور یہ بات اس کے لئے واقعی پریشانی کا  
باعث تھی۔

”جی..... وہ..... میں.....“ اس نے گہرا  
کر ساجدہ کی طرف دیکھا۔

”جی وہ میڈم!“

”ریلیکس پلزز، اتنا زور ہونے کی

ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو جو بھی بات کہنی ہے  
ریلیکس ہو کر کریں۔ میں آپ کی کمپلین پوری توجہ  
سے سنوں گی اور کوشش کروں گی کہ آئندہ آپ کو  
کوئی بھی پریشانی نہ ہو اور یہ بھی یقین رکھو کہ  
یہاں ہم تینوں کے سوا کوئی چوتھا فرد موجود نہیں  
ہے۔“ انہوں نے اپنی سوچ کے مطابق پوری  
یقین دہانی کروائی۔

”نو میڈم! ایسی ویسی تو کوئی بات نہیں ہے  
اسے تو بس.....“

”پلزز آپ خاموش رہیں انہیں بولنے دیں۔“  
انہوں نے نرمی سے کہا تو ساجدہ شرمندہ سی ہو کر  
خاموش ہو گئی۔

”میڈم! وہ مجھے.....“ اس نے تھوک لگا۔

”ہاں، ہاں کہو۔“ انہوں نے دوبارہ ہمت  
بندھائی تو وہ نظریں جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے  
لگی کہ انہوں میں اتنی نمی کو وہ اپنے اندر اتار  
لینا چاہتی۔

”میڈم! کچھ مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ  
انسان کو ہاتھ پھیلائے پر مجبور کر دیتی ہیں۔“ لہجہ  
میں نمی کھلنے لگی تو وہ پھر خاموش ہو گئی۔ خود پر قابو پا  
کر چند لمحوں بعد دوبارہ بولی۔

”میڈم! دراصل میں کمپنی سے لون لینے  
کے لئے اپلائی کرنا چاہتی ہوں اور آپ سے  
صرف یہ ہی ریکویسٹ ہے کہ پلزز آپ اس سلسلے  
میں ہماری کچھ مدد کریں۔“

”کیا بس یہی بات تھی۔“ ان کی بات میں  
حیرت نمایاں تھی۔

”جی۔“

”او مائی گاڈ!“ انہوں نے اپنا سر تھام لیا۔

”اور میں نجانے کیا، کیا سمجھ بیٹھی تھی۔“

انہوں نے گہری سانس لے کر اس کی طرف  
دیکھا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ جا رہی  
ہیں، اپنی دے، کہئے اس سلسلے میں، میں آپ کی



”او کے۔“ انہوں نے اس کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوتی لڑکی کو فوراً حکم صادر کیا۔  
”مس نوشاہ! آپ انہیں کل گیارہ بجے کی اپائنٹمنٹ دے دیں۔“  
”تھینک یو، تھینک یو ویری مچ میڈم، تھینک یو ویری مچ۔“ وہ انتہائی مشکور ہو رہی تھی۔

اس کے انتظار کا دورانیہ خاصہ طویل ہونا جا رہا تھا۔ وہ تقریباً پچھلے آدھے گھنٹے سے یہاں بیٹھی تھی لیکن ایم ڈی صاحب کی مصروفیت تھی کہ ختم ہی نہ ہو رہی تھی۔ ساجدہ نے آج اس کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنی زرد ہوئی رنگت اور کانٹے لرزتے وجود پر قابو پاتے آفس میں داخل ہوئی تھی اور ایم ڈی صاحب اس کو کرسی پر بیٹھنے کا حکم صادر فرما کر بھول چکے تھے۔ وہ اس آدھے گھنٹے میں نا صرف اسی شاندار آفس میں موجود ہر چیز کا بغور جائزہ لے چکی تھی بلکہ اب اس کا چہرہ بھی اور اس پر چھاننے والی ازیلی گھبراہٹ کی جگہ اب جھنجھلاہٹ نے لے لی تھی۔ اس کی بھٹکتی ہوئی نظریں ایم ڈی صاحب پر رکی تھیں جو کہ مسلسل ایک فائل میں سرگھسائے بیٹھے تھے اور وقفے وقفے سے آنے والی ٹیلی فون کالز کو بھی پوری توجہ سے سنتے اور پھر احکامات جاری کر رہے تھے۔ اسے شروع ہی سے ایسے انسانوں سے چڑ رہی تھی جو اپنی ہی شخصیت کے زعم میں رہتے تھے۔ اپنے سے کم حیثیت رکھنے والوں کو کسی بھی کھاتے میں نہ رکھنے والوں سے وہ نفرت محسوس کرتی تھی، لیکن۔

”آہ، ارے یہ مجبوریاں کہاں کہاں سر جھکانے پر مجبور کرتی ہیں۔“  
”سر پلیز! اگر آپ فارغ نہیں ہیں تو میں پھر آ جاؤں گی۔“ انہوں نے جیسے ہی ریسیور کریڈل پر رکھا تو وہ بول اٹھی۔

کیا ہیلپ کر سکتی ہوں۔“ ان کے پوچھنے پر وہ پھر ساجدہ کی طرف دیکھنے لگی جو کہ اب بالکل الاعلق سی بیٹھی تھی۔ لہذا اسے خود ہی ہمت کرنا پڑی۔  
”میڈم! وہ اصل میں ہم چھوٹے پیمانے پر کام کرنے والے ورکرز کو، آئی مین مین ہزار تک کے بے منٹ والے ورکرز کو ہماری کمپنی سے لان الاؤ نہیں کیا، تو اگر آپ اس سلسلے میں کچھ سفارش کر دیں، تو.....“  
”تھہر تھہر کر اپنا مدعا بیان کرتی سادہ سی لڑکی کے خوبصورت لب و لہجے کو دل ہی دل میں سراہے بغیر نہ رہ سکیں۔ لیکن جب بولیں تو ان کا انداز دو ٹوک تھا۔

”سفارش، امپا سبل، آپ جانتی ہیں اس آفس میں سفارش کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ہمارے ایم ڈی صاحب اصولوں کے بہت پکے ہیں وہ کبھی بھی یہ بات نہیں مانیں گے۔“ ان کے کہنے پر وہ ایک دم مایوس ہو گئی۔ اس کے چہرے سے امید کی پھوٹی کریمیں ماند پڑتے ہی اس کی شہابی رنگت ماند پڑ گئی۔ وہ بہت غور سے اس کی بدلی کیفیت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ نیچانے اس سادہ سی لڑکی میں ایسی کیا خاص بات تھی جو انہیں اٹریکٹ کر رہی تھی۔

”او کے میڈم تھینک یو۔“ وہ اٹھنے لگی کہ اس سے زیادہ اپنی انا کو مجروح نہیں کر سکتی تھی۔  
”ایک منٹ پلیز۔“

”میں آپ کی مدد صرف اس حد تک کر سکتی ہوں کہ ایم ڈی صاحب سے آپ کے لئے اپائنٹمنٹ لے لیتی ہوں آپ خود ان سے بات کر لیں، ہو سکتا ہے وہ آپ کی براہم دیکھتے ہوئے آپ کی ریکویسٹ پر غور کر لیں، لیکن اس کے لئے پہلے آپ کو ایک درخواست دینا ہوگی۔ آگے یہ ان پر ڈیپنڈ کرتا ہے کہ وہ اسے سائن کرتے ہیں یا نہیں۔“

”او کے میڈم! میں کل ہی درخواست لے آؤں گی۔“



کے تسمخرانہ انداز پر اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ وہ بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

”جی سر!“ ہونقوں کی طرح سوال کیا۔  
 ”دن رات ایک کرنا پڑتا ہے کرسیں گی آپ۔“ انہوں نے اس کے حلیے اور اعتماد سے عاری رویے پر چوٹ کی تھی۔  
 ”کوئی شکر کروں گی سر!“

”تو ٹھیک ہے، لون حاصل کرنے سے پہلے آپ کو ایک ایگریمینٹ سائن کرنا ہوگا کہ آپ پانچ سال تک اسی کمپنی کو چھوڑ کر جانے کی مجاز نہ ہوں گی۔“ انہوں نے سامنے رکھی فائل کی ورق گردانی کرتے کرتے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انہیں ایک دم ہی غصہ آگیا کہ وہ نجانے کیا سمجھ رہی تھی۔

”میں یہ شخص اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ ان پانچ سالوں میں شاید ہی یہ فرض اتارنے میں کامیاب ہو سکیں۔“ ان کی بات پر اس نے تھوک نکالا۔

”لیس سر! مجھے منظور ہے۔“

”او کے مسز خان اس بارے میں آپ کو گائیڈ کریں گی، یہ لیجئے۔“ انہوں نے اپنی کیپٹن پر سائن کر کے ان کی طرف بڑھائی جسے تھامتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”تھینک یو سر! تھینک یو ویری میچ۔“ اس نے انتہائی تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ وہ بھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اتنی بڑی مشکل اتنی جلدی حل ہو جائے گی۔ اس طرح سے نکلتے ہی انہوں نے رسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”مسز خان! یہ کیا چیز بھجوائی تھی آپ نے پلیز اس قسم کے کیسز آپ خود ہی ڈیل کر لیا کریں، بہت ٹائم ویسٹ کیا ہے اس لڑکی نے میرا۔“ کچھ لمحے دوسری طرف کی بات سنی اور دوبارہ گویا ہوئے۔

”نوںو مسز خان! مجھے مکمل بھروسہ ہے آپ

”آں۔“ انہوں نے چونک کر سر اٹھایا جو کہ رسیور رکھنے سے پہلے ہی فائل پر جھکا چکے تھے۔

”او آئی ایم سوری۔“ انہوں نے کہتے ہوئے فائل بند کر دی۔

”جی بی بی! کہیئے کیا پر ایلیم ہے آپ کے ساتھ۔“ اور اس کی جو گھبراہٹ مکمل طور پر مفقود ہو چکی تھی ان کے متوجہ ہوتے ہی عود کر آئی تو ہتھیلیاں بھیگ گئیں۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”محترمہ! میں آپ سے مخاطب ہوں۔“ انہوں نے اس کے انتہائی کم قیمت لباس پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی۔

”جی وہ سر میں.....“ اس کی بے جا گھبراہٹ بروہ جھنجھلا اٹھے۔

”دیکھیئے بی بی! میں بہت مصروف بندہ ہوں میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت بالکل نہیں ہے۔ جب آپ پوری طرح گھبرا چکیں تو مجھے بتا دیجئے گا۔“ انہوں نے خشک سے لہجے میں کہہ کر دوبارہ فائل کھولی۔

”وہ سر! یہ درخواست دیکھ لیجئے پلیز۔“ اس نے فوراً ہی ذرا سا اٹھتے ہوئے اس کے سامنے رکھے پیپر کی طرف اشارہ کیا۔

”ہوں، تو لون چاہیے آپ کو، لیکن کیا آپ جانتی ہیں کہ یہ ہماری کمپنی کے رولز میں شامل ہی ہے۔“ انتہائی روڈ لہجے میں سوال کیا گیا۔

”معلوم ہے سر!“ اس نے اس طرح سر جھکایا جیسے کسی جرم کا اعتراف کیا ہو۔

”کیا سیکری ہے آپ کی؟“

”تقریباً چھ ہزار۔“

”کتنے عرصے میں لون کی رقم ادا کر سکیں گی آپ۔“ انداز طنز یہ تھا۔

”میں اور ٹائم کر لوں گی سر!“

”اور ٹائم کا مطلب جھتی ہیں آپ۔“ ان

بے چینی کو  
کو فوراً حکم

یاد رہے بچے کی

سیڈم، تھینک  
ی۔

طویل ہونا جا  
نے سے یہاں

روفیت تھی کہ  
آج اس کے

اپنی زرد ہوتی  
بو پاتے آفس

تب اس کو کرسی  
لمے تھے۔ وہ اس

انداز آفس میں  
کی تھی بلکہ اب

ازلی گھبراہٹ  
لی تھی۔ اس کی

پر کی تھیں جو  
لے بیٹھے تھے اور

فون کالز کو بھی  
امات جاری کر

ایسے انسانوں  
ت کے زعم میں

رکھنے والوں کو  
دل سے وہ نفرت

کہاں کہاں سر

نہیں ہیں تو میں  
نے جیسے ہی رسیور



کے تمسخرانہ انداز پر اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ وہ بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

”جی سر!“ ہونقوں کی طرح سوال کیا۔  
 ”دن رات ایک کرنا پڑتا ہے کر سکیں گی آپ۔“ انہوں نے اس کے حلیے اور اعتماد سے عاری روئے پر چوٹ کی تھی۔  
 ”کوشش کروں گی سر!“

”تو ٹھیک ہے، لون حاصل کرنے سے پہلے آپ کو ایک ایگریمنٹ سائن کرنا ہوگا کہ آپ پانچ سال تک اسی کمپنی کو چھوڑ کر جانے کی مجاز نہ ہوں گی۔“ انہوں نے سامنے رکھی فائل کی ورق گردانی کرتے کرتے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انہیں ایک دم ہی غصہ آگیا کہ وہ نجانے کیا سمجھ رہی تھی۔

”میں یہ محض اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ ان پانچ سالوں میں شاید ہی یہ فرض اتارنے میں کامیاب ہو سکیں۔“ ان کی بات پر اس نے تھوک نگا۔  
 ”کیں سر! مجھے منظور ہے۔“

”او کے مسز خان اس بارے میں آپ کو گائیڈ کریں گی، یہ لیجئے۔“ انہوں نے اپیلی کیٹن پر سائن کر کے ان کی طرف بڑھائی جسے تھامتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”تھینک یو سر! تھینک یو ویری میچ۔“ اس نے انتہائی تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ وہ بھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اتنی بڑی مشکل اتنی جلدی حل ہو جائے گی۔ اس طرح سے نکلتے ہی انہوں نے رسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”مسز خان! یہ کیا چیز بھجوائی تھی آپ نے پلیز اس قسم کے کیمرز آپ خود ہی ڈیل کر لیا کریں، بہت ٹائم ویسٹ کیا ہے اس لڑکی نے میرا۔“ کچھ لمحے دوسری طرف کی بات سنی اور دوبارہ گویا ہوئے۔

”نو نو مسز خان! مجھے مکمل بھروسہ ہے آپ

”آں۔“ انہوں نے چونک کر سر اٹھایا جو کہ رسیور رکھنے سے پہلے ہی فائل پر جھکا چکے تھے۔

”او آئی ایم سوری۔“ انہوں نے کہتے ہوئے فائل بند کر دی۔

”جی بی بی! کہئے کیا پرانلم ہے آپ کے ساتھ۔“ اور اس کی جو گھبراہٹ مکمل طور پر مفقود ہو چکی تھی ان کے متوجہ ہوتے ہی عود کر آئی تو ہتھیلیاں بھیگ گئیں۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”محترمہ! میں آپ سے مخاطب ہوں۔“ انہوں نے اس کے انتہائی کم قیمت لباس پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی۔

”جی وہ سر میں.....“ اس کی بے جا گھبراہٹ پر وہ جھنجھلا اٹھے۔

”دھکیئے بی بی! میں بہت مصروف بندہ ہوں میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت بالکل نہیں ہے۔ جب آپ پوری طرح گھبرا چکیں تو مجھے بتا دیجئے گا۔“ انہوں نے خشک سے لہجے میں کہہ کر دوبارہ فائل کھولی۔

”وہ سر! یہ درخواست دیکھ لیجئے پلیز۔“ اس نے فوراً ہی ذرا سا اٹھتے ہوئے اس کے سامنے رکھے پیپر کی طرف اشارہ کیا۔

”ہوں، تو لون چاہیے آپ کو، لیکن کیا آپ جانتی ہیں کہ یہ ہماری کمپنی کے رولز میں شامل ہی ہے۔“ انتہائی روڈ لہجے میں سوال کیا گیا۔

”معلوم ہے سر!“ اس نے اس طرح سر جھکایا جیسے کسی جرم کا اعتراف کیا ہو۔

”کیا سیکری ہے آپ کی؟“  
 ”تقریباً چھ ہزار۔“

”کتنے غرصے میں لون کی رقم ادا کر سکیں گی آپ۔“ انداز طنز یہ تھا۔

”میں اوور ٹائم کر لوں گی سر!“  
 ”اوور ٹائم کا مطلب جھٹتی ہیں آپ۔“ ان



”بچے اماں۔“ اس نے تمام رقم ماں کے ہاتھوں پر رکھتی تو وہ بے یقینی سے دیکھنے لگیں۔  
 ”پورے پچاس ہزار ہیں اماں مہنی سے لون لیا ہے۔ اب آپ بسم اللہ کر کے کام شروع کریں اور میرا کام بس یہیں تک تھا اب جو کچھ بھی کرنا ہے آپ دونوں کو ہی کرنا ہے۔ کیونکہ مجھے اب یہ قرض اتارنے کے لئے بہت محنت کرنا ہے۔ پورے پانچ سال کا ایگریمنٹ سائن کروایا ہے مہنی والوں نے اس قرض کے بدلے میں یہ بتاتے ہوئے اس کے لہجے میں جھکن سی اتری تھی۔“

”پانچ سال، تو کیا اب تو پورے پانچ سال  
تک یہیں چھ ہزار کی نوکری پر رہے گی۔  
”تو پھر کیا کرنی میں اس کے سوا کوئی چارہ  
بھی تو نہیں تھا، بہر حال آپ فکر نہ کریں اللہ  
ماسبب الاسباب ہے۔“

”لیکن آج کے دور میں بچا پس ہمارے  
بیٹی تو رخصت نہیں ہوتی۔ لیکن خیر کچھ نہ ہونے  
سے تو بہتر ہے بستر تو میں نے آہستہ آہستہ شروع  
سے ہی بنا رکھیں ہیں اور کافی سارے برتن ہی  
تھوڑی بہت بچت کے ساتھ خریدی رہی ہوں اور  
کچھ کپڑا بھی راحیلہ نے اپنی محنت سے تیار کر  
رکھا ہے اور باقی آج محلے کی دو تین عورتیں آئیں  
میں انہوں نے بارات کے کھانے کی ذمہ داری  
اٹھانے کا کہا ہے اور وہ جو کونے والے چوہدری  
صاحب ہیں ناں انہوں نے بھی ساتھ رہنے کا  
وعدہ کیا ہے۔“ اماں کی باتوں پر وہ محض لب کاٹ  
کر رہ گئی۔

”آج بھی دنیا میں خوفِ خدا بہت سے بس  
اب تو زیادہ پریشان نہ ہو۔“ اماں نے گہری  
سانس لے کر کہا۔  
”اماں! آپ کسی سے کچھ نہیں لیں گی۔“

ضروری نہیں ہے کہ ہم کوئی لمبا چوڑا پردہ گرام  
ترتیب دیں۔ خیرات کے مال سے بچی کو رخصت  
کرے گی تو کیا عزت ہوگی اس کی اپنے سسرال  
میں کیا وہ سہرا تھا کر جی سکے گی بس آپ کو شش  
کریں کہ انہی پیسوں میں تھوڑا ہی لیکن عزت  
سے سب کچھ ہو جائے۔“ وہ دو ٹوک انداز میں  
کہتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی۔ وضو کیا نماز کے بعد  
شکرانے کے نوافل ادا کئے اور پھر سجدے میں سر  
رکھ کر بے اختیار رو دی اور پھر جیسے وہ دن رات کا  
شمار بھول گئی تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ شادی کی  
ڈیٹ کب فکس ہوئی دو ماہ کے اندر اندر اماں نے  
کیا خرید کیا بنا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ شادی کی  
تاریخ سر پر پہنچ گئی۔

”ریٹیل! کیا ہو گیا ہے تمہیں، تم نے تو  
جواب کو بالکل اپنے سر پر سوار کر لیا ہے۔“ ایک  
دن آخر ارجیلہ نے اسے پکڑ لیا۔  
”تمہیں تو یہ بھی احساس نہیں رہا کہ تمہاری  
آپنی اب صرف چند دن کی مہلانی ہے اس گھر  
میں۔“ وہ یہ کہتے ہوئے رو رہی تھی تو وہ خاموشی  
سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر اس  
کے قریب چلی آئی۔

”آئی ایم سوری آئی!“ اس نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ اس کے گلے لگ گئی۔ وہ انہیں تھامے چار پائی پر جا بیٹھی۔

”تم کیا جھگڑتی ہو مجھے کچھ معلوم نہیں بے حس ہوں میں، میں نہیں جانتی کہ تم یہ سب کچھ کس کے لیے کر رہی ہو۔“

”میں نے یہ سب کب کہا ہے آپی!“  
”تو کہو ناں کیوں نہیں کہتیں، کہوں تم نے  
ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا لیا ہے خود کو۔“

”جب میرے ارد گرد مجھ سے محبت کرنے والے میرا احساس کرنے والے موجود ہیں تو پھر میں کس بات کا احساس دلاؤں آپ کو۔“

”ریمیل! تم میرے لئے اتنا کچھ کر رہی ہو



معلوم نہیں میں تمہارے لئے کچھ کر بھی پاؤں گی کہ نہیں۔

”آئی! خدا آپ کو ڈھیر ڈھیر خوشیاں دے اتنی کہ آپ کا دامن بھی تنگ پڑ جائے اور میرے لئے یہی خوشی کافی ہوگی۔“

”دیکھو اب تم کچھ دن کی چھٹی لے لو۔“

”چھٹی، چھٹی تو بہت مشکل ہے آیا، ہاں بلکہ وقت پر گھر آ جایا کروں گی بارات تو اتوار کو آئے گی ناں۔“

”لیکن ریپل! اماں اکیلے گھر کیسے سنبھالیں گی۔“ وہ فکر مند تھی۔

”آیا! ہمارا کون سا مہمانوں سے گھر بھرا ڈاے اور کون آئے گا آپ کو رخصت کرنے وہ لوگ جنہیں یہ تک احساس نہیں ہوا آج تک کہ ان کا خون ان کی اولاد بھی کہیں اس دنیا میں ہے جنہوں نے تمہیں دو سال کی عمر میں ہی گھر سے نکال دیا تھا اور میرے دنیا میں آنے سے پہلے ہی سب رشتے توڑ دیئے تھے۔ چھوڑیں آئی! اگر آج تک ہم اپنے دکھ آپس میں بانٹتے رہیں ہیں تو خوشیاں بھی آپس میں ہی بانٹیں گے۔ چند ایک خوشیالی رشتے دار ہیں وہ بھی دن کے دن ہی آئیں گے کس کو لگاؤ ہے ہم سے۔“ وہ مسخرانہ انداز میں بولتی سر جھٹک کر اٹھ گئی۔

”بہر حال میں مسز خان سے بات کروں گی جو سکتا چند چھٹیاں مل جائیں۔“ ایمیل نے راحلہ کو تسلی دی۔

واقعی مسز خان بہت اچھی خاتون تھیں ہوں نے فوراً ہی اس کی درخواست پر سائن کروا دیے تھے۔

”فون کی بیل نے اسے متوجہ کیا اس نے صروف سے انداز میں ریسور اٹھا کر کان سے لیا۔“

”بیو۔“

”بیو، بیٹا کیسے ہیں آپ؟“

”اویس پایا! آئی ایم فائن، آپ کیسے ہیں۔“ وہ ایک دم ہی کھل اٹھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کی ماما کیسی ہیں انکا خیال رکھنا بیٹا!“

”وہ بھی بالکل ٹھیک ہیں پایا آپ کو بہت یاد کرتی ہیں آپ کب آئیں گے۔“

”میں اچھی نہیں آ سکتا بیٹا بہت بڑی ہوں۔“

”پلیز پایا! آپ تمام بزنس وائنڈ اپ کر کے یہاں آ جائیں ہمیں یہاں آپ کی بہت ضرورت ہے بہت مس کرتے ہیں ہم آپ کو، ماما بہت اداس رہتی ہیں۔“

”دیکھو بیٹا اپنی ماما کا بہت خیال رکھنا میں ابھی بہت بڑی ہوں میں ابھی نہیں آ سکتا لیکن تم اپنی مصروفیت میں اپنی ماما کو مت بھول جانا۔“ وہ فکر مند تھے۔

”پاپا! بالکل فکر مت کریں میں ان کا بہت خیال رکھتا ہوں۔“

”تھینک یو بیٹا! اسے ہماری بھرپور توجہ کی ضرورت ہے بہت دھی ہے وہ اندر سے۔ لیکن سمجھتی ہے شائد میں اس کے درد سے نا آشنا ہوں جیسی تو وہ ہمارے لئے مسکراتی رہتی ہے۔“

”آئی نو پایا! ماما بہت گریٹ ہیں اور آپ گریٹ بو گریٹ ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے کہتے کہتے شرارت سے مسکرا دیا۔

”اور پایا وہ آپ کی وائف ہی نہیں میری ماں بھی ہیں۔“ اس نے لہجے میں ناراضگی سموتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں بھئی میں جانتا ہوں تم بہت فرمانبردار بیٹے ہو ہمارے اور اب اسی فرمانبرداری کا امتحان ہوگا تمہارا۔“

”حکم کریں پاپا انشا اللہ میں ہر امتحان میں پورا اتروں گا۔“ اس نے ایک عزم سے کہا۔



”اے انکل جنید سے واقف ہونا تم۔“  
 ”جی جی بہت اچھی طرح ہے۔“  
 ”بہت پریشان ہے وہ آج کل، اپنی بیٹی کی وجہ سے۔“

”وہ کیوں؟“  
 ”وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیٹی بھی اپنی ماں کی طرح اس معاشرے کا حصہ بن جائے، جب کہ ایسا ہو رہا ہے۔“  
 ”او آئی سی۔“

”اس نے اپنی پریشانی مجھ سے شیر کی تو میں اپنے محسن کو پریشان نہ دیکھ سکا اور تم پر اعتماد کرتے ہوئے میں نے اکیلے ہی بہت بڑا فیصلہ کر لیا ہے بیٹا!“  
 ”جی بولے ناپاپا۔“ ان کے خاموش ہونے پر وہ فوراً بول اٹھا۔

”میں تمہارے مزاج سے بہت اچھی طرح واقف ہوں بیٹا! لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مہرے بننے میں ماشا اللہ وہ تمام کیس موجود ہیں جو کسی بھی لڑکی کو ایمپریس کر سکتے ہیں۔“ ان کے لہجے میں فخر تھا۔

”اور مجھے یقین ہے بیٹا! کہ تم اس لڑکی کو بہت پیار اور محبت سے اپنے رنگ میں رنگ لو گے اسی لئے میں اسے تمہارے لئے جنید سے مانگ لیا اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اس کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دو گے۔“ وہ ان کی پوری بات سن کر سر جھٹک کر مسکرا دیا۔

”آپ کی دعائیں ساتھ رہیں تو پاپا میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔“  
 ”تھینک یو بیٹا! مجھے تم پر فخر ہے۔“

”اس کا کریڈٹ آپ دونوں کو جاتا ہے پاپا!“ اس کی بات پر ایئر پیس سے ان کا جاندار قہقہہ برآمد ہوا۔

”او کے بیٹا! تو پھر وہ اگلے ہفتے پاکستان پہنچ رہی ہے اسے ایئر پورٹ سے ریسو کر لینا۔“

”او کے پاپا!“  
 ”او کے مائی چائلڈ، گڈ بائے اینڈ خدا حافظ۔“ انہوں نے کہا تو اس نے بھی خدا حافظ کہہ کر گہری سانس لیتے ہوئے ریوور کر یڈل پر رکھا کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اٹھا اور قد آدم آئینے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”تم میں وہ تمام کیس موجود ہیں جو کسی بھی لڑکی کو ایمپریس کر سکتے ہیں۔“ پاپا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو ایک بھر پور ہسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کر لیا۔

”پاپا بھی بس۔“ اپنی شخصیت کی تمام خوبصورتی کو بخوبی جانتے ہوئے بھی اسے اپنی ذات پر بھی غور نہ رہا تھا۔ ماں، باپ کی آپس کی محبت اور وہی ہم آہنگی نے اسے بہت اچھا اور خوبصورت شخصیت کا مالک بنایا تھا۔

”ہوں تو پاپا اب مجھے آپ کا یہ سر ہمیشہ بلند رکھنا ہے میں بھی آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ شادی تو آخر مجھے کرنا ہی ہے آج نہیں تو کل سہی میں کون سا محبت و محبت کا کوئی روگ پال رکھا ہے چلو اس آزمائش کے لئے ایک بگڑی ہوئی پور پین ہی سہی۔“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بول رہا تھا۔

”لیکن اس کے لئے آپ کو ایک ایگریمنٹ مجھ سے ضرور کرنا پڑے گا اور وہ یہ کہ کم از کم پانچ سال تک جب تک میں اسٹیبلیشمنٹ ہو جاؤں شادی نہیں کروں گا، ہاں البتہ مگنی کی جا سکتی ہے کیونکہ اسی میں کوئی حرج نہیں اور وہ تو ایک طرح سے ہو ہی گئی ہے۔“ وہ دل میں سوچتا ہوا کمرے سے نکل کر ماما کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”مس نوشابہ کی ایپلی کیشن آئی ہے۔ اسے تین ماہ کی لیو چاہیے۔“  
 ”واٹ، یو مین تھری منٹھ، بٹ وائے۔“



”اس کی شادی ہو رہی ہے بھئی اور کس لئے“ مسرز خان نے اپنی خوبصورت مسکراہٹ سمیت کمپنی کے ایم ڈی صاحب کے یاد دہانی کروائی۔ تو وہ سر تھام کر رہ گئے۔  
”او آئی سی۔“

”لیکن حنا جی ہمارے لئے بہت پر اہم ہو جائے گی۔ مس نوشاہہ پچھلے دو سال سے اس سیٹ پر ہیں اچھا کام کر رہی ہیں، شادی کے لئے تو پندرہ دن کی چھٹی کافی.....“

”ریلیکس ایم ڈی صاحب! ریلیکس، ٹیشن لینے سے مسائل حل نہیں ہوتے اور تم تو ایسے ری ایکٹ کر رہے ہو کہ جیسے نوشاہہ ہی آخری لڑکی ہو۔“

”اونو، میرا یہ مطلب نہیں تھا میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے کام کو سمجھ چکی ہے اور کسی بھی نئی لڑکی کے لئے کام سکھنے میں وقت تو لگے گا ناں جب کہ ہم یہ انورڈ نہیں کر سکتے۔“

”ڈونٹ وری، میں نے اس پر اہم کا ایک حل سوچا ہے اگر تم مناسب سمجھو تو۔“  
”کم آن مسرز خان! کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ میری رائٹ بینڈ ہیں اس کمپنی کو اس مقام تک پہنچانے میں جتنی کوشش اور محنت آپ نے کی ہے وہ بے مثال ہے۔“

”او کے او کے اب زیادہ مسکہ نہیں لگائیں اور میری بات سنیں۔“

”آفس میں ایک لڑکی ہے ”ریمل افتخار زیدی“ تمہیں شاید یاد ہو کہ تقریباً چھ ماہ پہلے اس نے لون لیا تھا کمپنی سے، مل چکے ہو تم اس سے۔“  
ان کے کہنے پر ایم ڈی کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں واضح ہوئیں۔

”ارے ہاں میں، وہ ڈرپوک اور بزدل سی لڑکی۔“

”جی ہاں وہی، لیکن حیرت انگیز طور پر وہ

لڑکی بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ تھوڑے عرصے میں اس نے بہت کور کیا ہے۔ وہاں کام کرنے والے تمام ورکرز میں سب سے زیادہ کوالیفائیڈ اور محنتی لڑکی ہے۔ تو میں چاہ رہی تھی کہ کیوں نے اسے ایک چانس دیا جائے جب تک مس نوشاہہ اپنی سیٹ پر نہیں آ جاتیں اسے ٹرائل پر رکھ لیا جائے۔“

”اوں، اپنی باؤ، این یوش، لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ ایسی لڑکیاں کم ہی امیدوں پر پوری اترتی ہیں، بزدل اور کم ہمت لڑکیاں۔“  
”چیک کرنے میں کیا حرج ہے۔“  
”او کے۔“

”تھینک یو میں جلد رپورٹ دوں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے کرسی تھسٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنی سیٹ پر پہنچ کر بیٹھنے سے پہلے انہوں نے بیل بجا کر چپڑاسی کو طلب کیا تھا جو ان کا آڈر لے کر فوراً ہی نکل گیا۔

”مے آئی کم آن میڈم!“ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے سامنے تھیں۔

”آپ نے مجھے بلایا میڈم!“ اس کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر وہ مسکرا دیں۔

”سیٹ ڈاؤن پلیز۔“  
”آپ کے لئے ایک خوش خبری ہے مس زیدی!“

”خوش خبری۔“ اس نے اچنبھے سے پوچھا تو انہوں نے ساری بات تفصیل سے اس کے گوش گزار کی وہ بہت خاموشی سے ان کی بات سن رہی تھی۔ وہ بات ختم ہونے تک بنا کسی تاثر کے بیٹھی رہی۔

”کیوں کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔“  
”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے میڈم لیکن میں سوچ رہی تھی کہ کانٹوں کے بستر پر ننگے بدن سونے والے کوریشم کا لباس پہنا دیا جائے اور کہا جائے کہ سونا تمہیں اسی بستر پر ہے تو.....“



”اوہ، ڈونٹ لی سلی، اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی اور یہ تو صرف ایک چانس ہے اگر اس میں تمہاری پراگرس اچھی ہوگی تو تمہاری پرموشن کے چانسز بھی ہو سکتے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ اب تک کمپنی کا کتنا قرض اتار چکی ہو تم۔“

”چھ ماہ میں کتنا ہو سکتا تھا میڈم! آنے میں نمک کے برابر بھی نہیں شاید۔“ اس نے سنجیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”تمہاری مسکراہٹ بہت خوبصورت ہے مسکرانے میں کنجوسی مت کیا کرو۔“ انہوں نے فرینکلی انداز میں اس کی تعریف کی تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”جانتی ہو اس سیٹ پر تمہاری سیلری کیا ہو گی۔“ اس کے سوال پر وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو انہوں نے جواب دیا۔

”کم از کم بھی دس ہزار، مس نوشاہ کی بارہ ہزار تھی اور تم چونکہ ٹرائل پر ہو اس لئے لیکن اس میں تم اپنی محنت سے اضافہ کر سکتی ہو، ہو سکتا ہے کہ آگے چل کے تمہیں اس سے بھی بہتر سیٹ مل جائے۔“ وہ اسے خوابوں کی دنیا میں لے جانا چاہ رہی تھیں۔ لیکن وہ اپنی قسمت کی تاریکیوں سے اچھی طرح واقف تھی اس لئے محض استہزائیہ مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

”او کے وش یو بیسٹ آف لک، تم کل سے میرے ساتھ اس کمرے کو شیئر کر رہی ہو۔“

”تین ماہ۔“ اس نے سوچا۔

”چلو کچھ نہ کچھ تو قرض کا بوجھ سر سے اترے گا ناں۔“

گھر پہنچ کر اس نے ساری بات اماں کے گوش گزار کی تو بے اختیار ہی ان کے ہاتھ اللہ کے سامنے اٹھ گئے۔

”یا اللہ تیرا شکر اور تو بھی خدا کا شکر ادا کر یہ نہ سوچ کہ تین مہینے بعد تجھے یہ سیٹ چھوڑنی پڑے گی۔ یہ تین مہینے بھی اللہ کی طرف سے غیبی

امداد ہے۔ ان چھ مہینوں میں دس ہزار تو اتر گئے ہیں باقی ان تین مہینوں میں ہم دو افراد کی دو وقت کی روٹی کے لئے کچھ میری سلائی اور کچھ تمہاری تنخواہ کا حصہ دو ہزار ہی کافی ہیں۔ ہم روٹی سوٹی کھا کر گزارہ کر لیں گے بس تو جلد از جلد اس قرض سے جان چھڑا لیکن اب زیادہ جان مارنے کی ضرورت نہیں ہے ٹائم سے گھر آ جایا کرنا دیکھو کیا حالت ہو گئی ہے تیری مجھے تو دن رات تیری فکر کھائے جاتی ہے۔“

وہ بہت خاموشی سے لیٹی اماں کی باتیں سن رہی تھی۔

”اماں! ابا کی کچھ خبر آئی؟“

”ہاں چرسیوں کے اڈے پر چھاپہ مارا تھا پولیس نے سب کو پکڑ کر لے گئے۔ باقیوں کو تو چھوڑ دیا پر تیرا باپ کوئی خاص بندہ تھا ان کا اسی لئے سزا ہو گئی ہے۔“ اماں نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا تھا جب کہ اس کے دل پر منوں بوجھ آگرا وہ وہی لیٹی کافی دیر تک آسمان پر اڑتے پرندوں کو اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور مغرب کی اذان ہوتے ہی اٹھ کر وضو کیا اور نماز ادا کرنے لگی جو کہ اس کی زندگی کا سب سے اہم فریضہ تھا جسے وہ بہت دیانتداری سے ادا کرتی تھی۔

ٹائپٹ ریڈ سیلیولیس شرٹ بلو ٹراؤزر میں ملبوس اوپچی ہیل پہنے ایشائی نقوش اور یورپین رنگت کی وجہ سے وہ باہر آنے والے تمام مسافروں میں منفرد نظر آتی۔ انگلینڈ میں چونکہ وہ چند ایک بار پہلے بھی اسے مل چکا تھا اس لئے پہچاننے میں دقت نہ ہوئی وہ ٹک ٹک کرتی اس کے پاس آن رکی ہاتھ میں پکڑی تصویر کو دیکھا اور پھر اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

”آئی ایم روز!“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

”آئی نو۔“ اس نے مسکرا کر ہاتھ تھاما۔



”آئی ایم“ احزم حسن!“

وہ بھی ”اوکے“ کہہ کر ڈگی میں سامان رکھنے لگا اور ایک شانِ تقاخر سے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔

”کیسا رہا آپ کا سفر۔“ وہ گاڑی اشارت کر کے روڈ پر لے آیا۔  
”فرنٹ کلاس۔“

”مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے آپ سے مل کر آپ بالکل میرے آئیڈیل کی طرح ہیں۔“ انگلش لہجے میں بولا گیا اردو جملہ اس کی خوبصورت آواز پر بہت سوٹ کیا تھا وہ مسکرا دیا۔

”شاید آپ کو یاد نہیں، ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔“

”ریلی۔“ اس کی حیرت بجا تھی۔

ہزاروں دوستوں کے جھرمٹ میں رہنے والی کو ایک آدھ بار ملنے والی شخصیت کیسے یاد رہ سکتی تھی۔

”پاپا اور انکل کیسے ہیں۔“ اس نے اس کی حیرت کو نظر انداز کیا۔  
”ویری فائن۔“

”یونو، میں تو یہاں آنا نہیں چاہ رہی تھی سنا ہے بہت بیک ورڈ سوچ ہے لوگوں کی یہاں، لیکن پاپا نے زبردستی بھجوایا ہے اور پھر انکل نے آپ کی تعریفیں کی کہ میں بھی انٹرسٹڈ ہو گئی۔“ وہ بات مکمل کر کے ہلکھلا کر ہنس دی۔

”یوں تو پاپا کہہ رہے تھے آپ ایسے انسان ہیں جو مجھے سیدھے رستے پر لے آئیں گے۔“  
”ویری فنی۔“ اس نے اپنی بات کو خود ہی انجوائے کیا۔

”جب کہ میرے بوائے فرینڈز کا خیال ہے کہ میں تو بڑے بڑوں کا ایمان لمحوں میں متزلزل کر سکتی ہوں۔“ اس نے ایک ادائے ناز سے کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ماتھے پر

سلوٹ پڑ گئی اس تھوڑے سے وقت میں ہی وہ جان گیا تھا کہ وہ اچھی خاصی باتونی اور خود پسند لڑکی ہے بولنا اور بلا متکان بولنا اس کا محبوب مشغلہ ہے اور پھر سارے راستے وہ صرف ہوں ہاں ہی کرتا رہا۔

گھر پہنچ کر وہ اس سے پہلے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آئی جب کہ اس نے باہر نکلنے سے پہلے سر کو ہلکا سا دبایا تھا۔

پاپا کیا چن کر ہیئر اتلاش کیا ہے آپ نے میرے لئے۔“ اس نے مسخرانہ انداز میں مسکرا کر سر جھٹکا اور باہر نکل آیا۔

”واؤ ویری فنفاشنگ۔“ اس نے وہیں کھڑے کھڑے وسیع و عریض لان پر نظر دوڑائی اور سراپے بنا نہ رہ سکی اس نے ملازم کو اشارہ کر کے سامان اندر لے جانے کو کہا۔ پاپا شاید ان کے ہی انتظار میں برآمدے میں کھڑی تھیں۔

آپ کی ماما بہت گریس فل لیڈی ہیں۔“ اس نے اس کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے ہوئے کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تھینک یو کہنا پڑا۔

”آئی تھینک کہ اب تک مجھے یہاں کی ہر چیز اٹریکٹ کر رہی ہے آئی بلیو کہ میرا دل یہاں لگ جائے گا۔“

”تمہاری اردو کافی اچھی ہے۔“ وہ جو کافی دیر سے کہنا چاہ رہا تھا آخر اسے موقع مل ہی گیا۔  
”ریلی؟ بٹ پاپا تو ابھی بھی سیٹس فانی نہیں ہیں۔“ وہ ماما کے پاس پہنچ چکے تھے۔

”ہیلو آنٹی! اور سوری پاپا نے تو کہا تھا کہ سلام کرنا ہے۔ السلام وعلیکم آنٹی!“

ماما اس کی معصومیت پر مسکرا دیں اور بڑھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ایسا کیوں نہ ہوتا وہ تو آج بہت خوش تھیں کہ ان کی ہونے والی بہوان کے گھر آئی تھی جسے ان کے محبوب اور بہت ہی محترم شوہر نے ان کے ہونہار بیٹے کے لئے چنا



تھا۔ وہ ایک بار پھر شارٹ ہو چکی تھی۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔  
ماما نے ڈر کے لئے اچھا خاصہ اہتمام کر رکھا تھا اور اسے اصرار کر کے کھلا رہی تھیں۔

”میرا خیال ہے آنٹی! کہ میں اتنا ہیوی ڈنر کر کے دنوں میں موٹی ہو جاؤں گی اور اگر ایسا ہوا تو یقیناً آپ کا یہ بیٹا مجھے فوراً رتھکلیٹ کر دے گا جو کہ میں ہرگز نہیں چاہتی۔“  
وہ ماما کے سامنے ایسی بات کرنے پر جھل سا

ہو گیا۔  
”آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے آنٹی! لیکن پایا نے مجھے بتایا تھا کہ ویسٹ میں لڑکیاں شادی سے پہلے سسرال میں نہیں رہتیں۔ اس لئے پایا نے میرے یہاں آنے سے پہلے ہی میرے لئے یہاں ایک اپارٹمنٹ خریدا تھا۔ اس لئے میں آپ کو یہاں زیادہ دن بور نہیں کروں گی۔“  
”لیکن بیٹا! آپ اکیلی وہاں کیسے رہیں گی۔“

”تو پر اہلم آنٹی، میں تو بہت عرصے سے اکیلی رہ رہی ہوں، ماما اور پایا کی ڈائیس کے بعد دونوں میں جھگڑا رہتا تھا ماما مجھے اپنے پاس اور پایا اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اس لئے میں نے یہ جھگڑا ہی ختم کر لیا اور علیحدہ رہنے لگی اور ان لوگوں کا جب جی چاہتا آ کر مجھ سے مل جاتے لیکن وہاں کے پیرنس کے پاس بچوں کے لئے زیادہ وقت نہیں ہوتا اس لئے اب میں عادی ہو چکی ہوں اور اب تو اپنی پرائیویسی مجھے بہت عزیز ہو گئی۔ میری زندگی میں کسی کی مداخلت مجھے زیادہ پسند نہیں ہے۔“

اس کی باتوں کے جواب میں وہ محض اپنے بیٹے کو دیکھ کر رہ گئیں اور وہ نظریں چرا کر وہاں سے اٹھ گیا۔

”سریہ ہیں، مس ریمیل افتخار زیدی جنہوں

نے آج ہی مس نوشاہہ کی جگہ جوآن کیا ہے۔“  
مسز خان کے بتانے پر انہوں نے بہت اچھتی سی نظر اس پر ڈالی۔

”اوکے، بٹ مسز خان انہیں آپ اس سیٹ کے کچھ میز اور ایئر کنڈیشنر سے بھی آگاہ کر دیجیے۔“ انہوں نے کہا اور دروازہ کھولتے ہوئے چلے گئے جب کہ خفت کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مسز خان جو کہ اپنی سیٹ کے پاس کھڑی تھیں مسکرا کر اس کے پاس چلی آئیں۔  
”میڈم! پلیز آپ یہاں کسی اور کو اپارٹمنٹ کر لیجئے میں اس سیٹ کی اہل نہیں ہوں۔“

”کم آن یار! زیادہ ڈس ہارٹ ہونے کی ضرورت نہیں تمہیں کچھ زیادہ نہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ اس بارہ بجانی شکل پر تھوڑی سی فریش نس لاؤ اور سب سے پہلے تو اس تنبو سے جان چھڑاؤ اپنی“ انہوں نے اس کی سیاہ چادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میڈم! اس سیٹ کے لئے اگر مجھے اپنی چادر جو کہ عزت اور وقار ہے عورت کا اتارنی پڑے تو سوری، مجھے یہ آفر قبول نہیں ہے۔“ وہ اس سیٹ سے کچھ دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔  
میڈم چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہیں اور پھر شانوں سے تھام کر اسے سیٹ پر بٹھا دیا۔  
”بیٹھو یہاں، میں تمہیں چادر اتارنے کے لئے نہیں کہہ رہی ہوں بلکہ سمجھا رہی ہوں کہ تم سوٹ کے ہم رنگ چادر یا دوپٹہ بھی تو لے سکتی ہو۔“ اس نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔  
”میں کوشش کروں گی میڈم!“

”ریمیل تم نجائے کیوں پہلی ہی نظر میں مجھے اچھی لگی تھیں، عام لڑکیوں سے ہٹ کر بہت ڈری اور سہمی ہونے کے باوجود بہت نائس اور سوہری۔“ وہ ان کے نرم اور اپنائیت سے بھرپور لہجے میں کہنے پر بہت شرمندہ سی ہو کر نظریں جھکا



جوان کیا ہے۔  
نے بہت اچھی

نہیں آپ اس  
سے بھی آگاہ کر  
کھولتے ہوئے  
اس کا چہرہ  
بٹ کے پاس  
آئیں۔  
کسی اور کو  
لی اہل نہیں

ہونے کی  
ف اتنا کرتا  
فریش نس  
جان چھڑاؤ  
کی طرف

مجھے اپنی  
کا اتار لی  
ہے۔ وہ  
متی رہیں  
ہا دیا۔  
نے کے  
وں کہ تم  
لے سکتی  
یکھا۔

نظر میں  
کر بہت  
اس اور  
ہے پھر  
میں

گئی۔

اور پھر اس نے کچھ زیادہ وقت نہیں لیا کام  
سمجھنے میں مسز خان نے بہت ہلپ کی تھی اس کی  
اور اب اس نے سارا کام سنبھال لیا تھا۔

”سر! پلیز یہ فائل چیک کر لیں۔“ اس نے  
فائل ایم ڈی صاحب کے سامنے رکھی۔

”اوں، ہوں، ویری گڈ، آپ نے بہت  
جلد امپرو کیا ہے مس زیدی!“ انہوں نے بے  
ساخۃ تعریف کی تو وہ محض ”تھینک یوسر!“ کہہ کر  
خاموش ہو گئی وہ تیزی سے فائل میں موجود پیپرز  
پرسائن کرنے لگے۔

”اور وہ جولیئر میں نے کل آپ کو دیا تھا۔“  
”لیس سر! وہ کمپلیٹ ہے۔ یہ دیکھیں سر!“  
اس نے ایک اور فائل ان کی جانب بڑھائی۔

”اوکیس ویری گڈ، آپ کو معلوم ہے ناں  
منڈے کو میٹنگ ہے، اس کی تیاری کمپلیٹ  
ہے؟“

”لیس سر! میں نے تمام سلائیڈز بنالیں ہیں  
اور تمام کمپینز کے لیٹرز علیحدہ علیحدہ فائل بنا کر انہیں  
سیف کر دیا ہے اور باقی بھی تمام پوائنٹس کونوٹ  
کر لیا ہے۔“ اس کا انداز بہت فارل تھا۔  
”ایکسیلنٹ، آپ تو بہت جیمنس ہیں مس  
زیدی!“

”تھینک یوسر!“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔  
”آپ نے پہلے کسی اچھی جاب کے لئے  
اپلائی کیوں نہیں کیا جب کہ آپ تو کمپیوٹر کو بھی  
بہت اچھی طرح انڈرستینڈ کرتی ہیں۔“

”مجھے جاب کی بہت سخت ضرورت تھی سر  
اس لئے فوری طور پر جو سامنے آئی وہ کر لی۔“ اس  
کا انداز بہت سپاٹ سا تھا۔ انہوں نے پہلی بار  
فائلیں اٹھائی اس لڑکی کو غور سے دیکھا۔ انہوں  
نے نوٹ کیا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بات  
نہیں کرتی تھی مسکراتی تو وہ ضرورتاً بھی نہیں تھی۔

جتنی تعریف وہ اب تک اس کی کر چکے تھے اگر  
اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو خوشی سے پھولے نہ ماتا  
جب کہ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے سوا کوئی  
دوسرا تاثر نہیں تھا۔ وہ جاچکی تھی۔

”عجیب ڈل سی لڑکی ہے۔ عام لڑکیوں سے  
قدرے مختلف نہ کوئی شوق نہ کوئی فیشن۔“ اور  
اگلے دن وہ اپنی سچ مسز خان سے شیئر کئے بنانہ  
رہ سکے۔

”بالکل صحیح اندازہ ہے تمہارا، لیکن دیکھا  
جائے تو یہ ہمارے لئے بہت بہتر ہے۔ مس  
نوشاہ یہ کام تو ٹھیک ہی کر رہی تھیں، لیکن اکثر  
لیٹ آئیں تھیں اور بھی ان کا میئر سائل خراب ہو  
جاتا تو بھی لب اسٹک جنہیں سنوارنے میں بہت  
سامانم ویسٹ کر دیتی تھیں۔ جب کہ مس زیدی  
جب تک آفس میں ہوں ایک سینڈ بھی ضائع  
کئے بغیر کام کرتیں ہیں۔“ مسز خان نے  
مسکراتے ہوئے دل کھول کر تعریف کی تھی۔

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن حنا جی اس دور  
میں یہ سب بہت ڈفرنٹ نظر آتا ہے آج لوگ  
گلیمر کو زیادہ پسند کرتے ہیں خوبصورت ماڈل کی  
ایک مسکراہٹ دیکھنے کے لئے بہت دور دور سے  
چلے آتے ہیں جب کہ سنجیدہ اور خشک رویے  
دوسروں کو متوجہ نہیں کرتے۔“

”آپ اس کی فکر چھوڑو ہمیں اسے  
رہسپشن پر ٹوکھڑا نہیں کرنا آپ کے اور میرے  
ساتھ ہی کام کرنا اور ہماری ڈیمانڈ تو صرف کام  
ہے اور وہ بہت محنت سے کر رہی ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے مان گئے آپ کی چوائس کو۔“  
اس عرصے میں وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ  
چکی تھی کہ ایم ڈی صاحب اور مسز خان صرف  
افسر اور ماتحت ہی نہیں اپنے دوست بھی تھے۔  
اچھی خاصی انڈرستینڈنگ تھی دونوں کے درمیان  
اکثر کام کی زیادتی کے باعث وہ سچ بھی اکٹھے ہی  
کرتے تھے کوئی اہم ڈسکشن کرنا ہوتی تو وہ چائے



بہت پاکیزہ تھے اور پھر مسز خان تفصیل سے  
اسے اپنے بارے میں بتانے لگیں۔

وہ جب سے آئی تھی ہر وقت اس کے پر سر  
سوار رہنے کی کوشش کرتی تھی تو جب وہ آفس چلا جاتا  
وہ سو رہی ہوتی لیکن سچ ٹائم میں آن دھکتی تھی۔  
سچ اور پھر آؤٹنگ، اس کا اچھا خاصہ ٹائم ویسٹ ہو  
جاتا۔

رات کو وہ تھکا ماندہ گھر آتا تو اس کی کوشش  
ہوتی کہ جلد از جلد سو جاؤں لیکن وہ چاہتی تھی کہ  
وہ دیر تک اس کے ساتھ جاگے لاٹک ڈرائیو اور ہلا  
گلہ کرے جب کہ وہ یہ سب افورڈ نہیں کر سکتا  
تھا۔ شروع کے چند دنوں میں تو اس کی حسب  
خواہش یہ سب کیا لیکن اب وہ مزید اس کا ساتھ  
نہیں دے سکتا تھا۔ بہت سی وجوہات میں ایک  
وجہ یہ بھی تھی کہ ہر روز اس کے آفس چلے آنے پر  
پورے شام اس سے اس کے رشتے کی نوعیت جان  
چکا تھا بلکہ روز نے خود الاعلان سب کو یہ بات  
بتائی تھی اور سچا نے یوں ان سب کے سامنے  
اسے شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ  
اس کا لباس اور اس کا لائف سٹائل تھا۔ اس کے  
ساتھ آفس سے باہر نکلتے ہوئے لوگوں کی معنی خیز  
مسکراہٹ اسے الجھن میں مبتلا کر دیتی۔ وہ اس  
کے مزاج کے بالکل برعکس تھی۔ اسے ایسا لگتا  
جیسے سب کی آنکھیں اس سے پوچھ رہی ہوں کہ  
”احزم حسن گیلانی“ کیا یہ تھا تمہارا ٹائیسٹ“ لیکن  
اس سب کے باوجود وہ دو ٹوک انداز میں اسے  
منع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ شروع کے چند دنوں  
میں ہی اس کی ضدی اور خود سر طبیعت سے واقف  
ہو گیا تھا اور ایسے انسانوں کو کیسے ڈیل کیا جاتا ہے  
وہ بخوبی جانتا تھا اس لئے وہ اسے بہت مناسب  
الفاظ میں نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

”دیکھو روز! میں نے ابھی نیا نیا برنس  
سٹارٹ کیا ہے۔ فقط چار سال ہوئے ہیں اور ان

کا آؤر لے کر ایم ڈی صاحب کے آفس جانے  
سے پہلے اسے آفر کرنا نہ بھولیں جسے وہ بڑی  
خوبصورتی سے رد کر دیتی وہ یہاں آنے کے بعد  
میں اپنی پہلی کونسلز کو نہیں بھولی تھی وہ ان کے ساتھ  
میں سچ کرتی۔ تھوڑی سی گپ شب بھی ہو جاتی کہ  
ماحول کی اجنبیت سے اس کا ذہن جو تھوڑا بوجھل  
ہو جاتا وہ بھی فریش ہو جاتا تھا۔

دن رات کا یہ چکر جاری تھا تین ماہ مکمل  
ہونے میں صرف دس دن باقی تھے پھر اسے یہ  
سیٹ چھوڑنا تھی وہ کچھ اب سیٹ تھی۔

”اُداس کیوں ہو تمہارا کام بورڈ آف ڈائریکٹرز  
کی نظروں میں آچکا ہے یقیناً وہ تمہارے لئے  
کوئی اچھا فیصلہ کریں گے۔“

”میڈم! میں اس سیٹ کے لئے پریشان  
نہیں ہوں بلکہ آپ کے ساتھ کام کرنا اچھا لگ  
رہا تھا۔“

”ہاں شاید میں بھی تمہاری عادی ہو گئی ہوں  
میں نو شاہہ دو سال سے میری ہیلمپر رہی ہیں لیکن  
ان کے ساتھ وہ محبت اور اپنائیت نہیں ہو سکی جو  
میں تمہارے لئے فیل کرتی ہوں۔“

”میڈم! ایک بات پوچھوں آپ برا تو نہیں  
مانیں گی۔“

”اگر برا ماننے والی بات ہوئی تو ضرور  
مانوں گی۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”پھر رہنے دیں۔“

”ارے نہیں تم پوچھو میں برا نہیں مانوں  
گی۔“ وہ ہنس دیں۔

”ایم ڈی صاحب کے ساتھ آپ کی.....“

اس کے جھجک کر پوچھنے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔  
وہ آج یہ بات کلیئر کرنا چاہتی تھی کیونکہ

دوسروں کی نظر میں جو بھی ہو لیکن اس نے جو  
محسوس کیا تھا وہ محض دوستی ہی نہیں کوئی بہت  
مقدس اور محترم رشتہ تھا کیونکہ دونوں کی آنکھوں

میں ایک دوسرے کے لئے نظر آتے جذبات



چار سالوں میں، میں نے دن رات ایک کیا ہے، بہت محنت کی ہے میں نے بزنس کی دنیا میں قدم جانے کے لئے۔ میرا بزنس اس فیلڈ میں ابھی بھی بالکل نوزائیدہ بچے کی طرح ہے۔ بزنس فیلڈ میں سروائیو کرنے کے لئے میں نے اپنی زندگی کا سب سے اہم کام پس پشت ڈال رکھا ہے۔

”سو واٹ، آخر تمہیں ضرورت کیا ہے یہ سب کرنے کی انکل کا اتنا پھیلا ہوا بزنس آخر تمہارا ہی تو ہے تو پھر آخر تمہیں کیا ضرورت ہے اتنی محنت کی۔“

”بے شک پاپا کا سب کچھ میرا ہے، لیکن میں پکا ہوا پھل کھانے کا عادی نہیں ہوں اپنی محنت کا پھل کھانا چاہتا ہوں۔ صرف پاپا کے نام سے نہیں اپنے نام سے آگے بڑھنا چاہتا ہوں، اپنی دے یہ سب تمہیں بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ابھی میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا اور میرا تم سے بھی یہی مشورہ ہے کہ تم بھی اپنا وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کوئی جاب کرلو۔ خود کو تھوڑا بیدار کرنے کی کوشش کرو یہاں کے ماحول کے مطابق تھوڑا ڈریس چیج کرو۔“

”واٹ جاب، ڈریس چیج۔ مسٹر احزم وہاں پاپا کے ساتھ بھی میرا یہی اختلاف تھا کیونکہ بزنس جاب وغیرہ میرا مانسڈ نہیں ہے اور تم اس خیال کو دل سے نکال دو کہ میں تمہاری خاطر خود کو بدل لوں گی۔ نہیں ہرگز نہیں ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔“ وہ انگریزی میں چیخ کر بول رہی تھی۔ ”نہیں میں نے یہ کب کہا۔“ وہ اس کی بات پر گڑبڑا گیا۔

”دیکھو میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ٹھیک ہے اگر تم جاب کرنا نہیں چاہتیں تو اپنی پڑھائی دوبارہ سے شروع کر لو کوئی اگر وہ بھی نہیں تو کوئی بوتیک یا کوئی بیوٹی سیلون کھول لو۔“ وہ بہت رسان سے بولا کہ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ پاپا کے سامنے کسی بھی امتحان

میں فیل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس کی کوئی بھی بات سننے کے لئے تیار نہ تھی۔

”میرا خیال ہے کہ مسٹر احزم حسن کہ میں اپنے فیصلوں میں خود با اختیار ہوں مجھے کیا کرنا ہے کیا نہیں یہ میں تم سے بہتر جانتی ہوں۔“ اس نے کہا اور پاؤں پچھتی وہاں سے چلی گئی۔

”یہ تو بڑی میزھی ٹھہر ہے بھی۔“ وہ سر تھام کر رہ گیا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کسی بھی انسان کو زبردستی پکڑ کر کسی دوسرے رستے پر نہیں چلایا جاسکتا تھا آہستہ آہستہ بالکل غیر محسوس طریقے سے ہی وہ اسے اپنی راہ پر لاسکتا تھا۔ لیکن ابھی اس سب سے لئے اس کے پاس بالکل وقت نہیں تھا صرف ایک اس کی وجہ سے اپنا اور اپنے باپ کا نام نہیں ڈبو سکتا تھا اسے بھی اپنے باپ کی طرح بزنس میں نام پیدا کرنا تھا جس کے لئے اس نے اپنا ہر اہم کام پس پشت ڈال رکھا تھا۔

”یہ لیجئے جناب یہ رہا مسز نو شاہ کا سٹینڈ۔“ مسز خان نے بہت خوبصورتی سے مسکراتے ہوئے ایم ڈی صاحب کو آگاہ کیا۔

”ہاؤ ویری سٹیرنج، آپ کی تو دلی مراد بھر آئی مسز خان کا ٹگر بچولیشن، مس زیدی کو یہ خوشخبری دی آپ نے۔“ وہ بھی مسکراتے ہوئے مطمئن سے انداز میں بولے کہ وہ بھی تو اس کے کام کرنے کے شائل سے خاصے مرعوب تھے۔

”نہیں ابھی نہیں اپنا ٹنٹ لیٹر ہی دوں گی اس کے ہاتھ میں۔“

”ویسے بہت لک ہے اس لڑکی کی۔“

”ہاں واقعی، ورنہ کچھ عرصہ پہلے میرے کمرے میں داخل ہونے والی اس لڑکی کے متعلق کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ہمارے لئے اتنی اہم ہو جائے گی کہ ہم خود اسے یہاں روکنے کی کوشش کریں گے نجانے اس لڑکی میں سادگی اور سنجیدگی کے باوجود کیا خاص بات ہے کہ دل خود بخود اس



”کیوں کیا کام بہت زیادہ ہوتا ہے۔“ اس نے فکر مندی سے کہا، ان دونوں بہنوں میں بہت محبت کے ساتھ ساتھ بہت دوستی بھی تھی۔ انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”سارے گھر کا کام مجھے تنہا کرنا پڑتا ہے، سانس صلیب کہتی ہیں۔ غریب گھر کی لڑکی اس لئے لائی ہوں کہ گھر سنبھالے ورنہ اپنے پڑھے لکھے بیٹے کے لئے تو وہ امیر گھرانے کی زیادہ جہیز لانے والی بہو لانا چاہتی تھیں۔“ انہوں نے طنز یہ سے انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں آیا وہ بھی تو آپ کی ماں ہیں۔ ان کی خدمت کرنا آپ کا فرض ہے اور پھر آپ کے تو سارے دیور ہی ہیں جو کہ صبح کے نکلے شام کو ہی گھر آتے ہوں گے۔“ اس نے اس کی دلجوئی کی تو وہ مسکرا دی۔

”تم بہت اچھی ہو ریمیل میری جان اس لئے لوگوں کے رویوں کا اندازہ نہیں ہے تمہیں۔“ خیر تم پریشان مت ہو میں اپنے گھر بہت خوش ہوں شہزاد بہت اچھے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں میرا، لیکن چونکہ گھر کے بڑے بیٹے ہیں تو ان کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بہت بوجھ ہے اس لئے مجبور ہیں۔ بہر حال خدا سے امید اچھی رکھنی چاہیے۔“ انہوں نے مسکرا کر تسلی بھرے انداز میں کہا۔

”گڈ، چلیں اماں کے پاس کچن میں چلتے ہیں۔“

”اماں کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ میں خود ہی آفس سے آکر کھانا بنا لیا کروں گی لیکن آپ ہیں کہ منع ہی نہیں ہوتیں۔“ اس نے ان کو چوٹے کے پاس سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”ارے سارا دن گھر کے کام اور پھر سلائی کڑھائی میں مغز ماری کرتیں ہیں میرے ہوتے ہوئے تو کچھ آرام کر لیا کریں۔“

”کے لئے کچھ کرنے کو چاہتا ہے۔“  
”ہاں اور شاید اسی لئے آپ نے کمپنی سے لون لینے میں اتنی مدد کی تھی ورنہ کمپنی کی حالت سے آپ بھی اچھی طرح واقف تھیں۔“

”ہاں نبھانے کیوں اور مجھے تو حیرت اس وقت ہوئی جب اس کی اپیلی کیشن پر آپ نے بلا تامل سائن کر دیئے۔“

”شاید اس کی بیچاری پر ترس آ گیا تھا۔ اپنی وے جائے آپ جا کر انہیں یہ خبر سنا میں۔“ اور وہ فوراً ہی وہاں سے اٹھی تھیں۔

اور وہ گنگ سی ایپنمنٹ لیٹر کو تھامے دیکھتی رہ گئی اور پھر اس کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہہ نکلے اور پھر جسے زندگی کو تمام واہموں سے نجات مل گئی تھی۔ وہ جو ہاتھ کو بہت پرکتے ہوئے آدھے سے زیادہ قرض ادا کر چکی تھی اب آدھی تنخواہ نکلوانے لگی۔ اپنے لباس پر توجہ دینے کے

بعد اس کی پہلی ترجیح گھر کی بنیادی ضرورتیں تھیں۔ جنہیں وہ ناچاہتے ہوئے بھی ہمیشہ نظر انداز کرتی آئی تھی اور پھر دن رات کی تک و دو اور محنت سے ان کی کمپنی کو اچھا خاصا پرافٹ ہوا تھا جس کی خوشی میں ایم ڈی صاحب نے الاؤنسز تمام ورکرز کو دیئے تھے۔

گھر آتے ہی اس نے شکرانے کے نوافل ادا کئے تھے اس کی اتنی ڈھیروں کامیابیوں کے باوجود بھی راحیلہ کافی عرصے سے نہ آسکی تھی۔ آج وہ اس کی ترقی اور کامیابی پر مبارکباد دینے آئی تھی۔

”کیا بات ہے آیا بہت دیک لگ رہی ہیں آپ۔“ اس نے تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

”نہیں تو، میں تو ٹھیک ہوں، کافی عرصے بعد دیکھا ہے نا تم نے اس لئے اور کچھ کام کی زیادتی کی وجہ سے تھک جانی ہوں شاید اس لئے بھی۔“

”نہیں تو، میں تو ٹھیک ہوں، کافی عرصے بعد دیکھا ہے نا تم نے اس لئے اور کچھ کام کی زیادتی کی وجہ سے تھک جانی ہوں شاید اس لئے بھی۔“



ایڈ پر اس کے آفس سے آنے سے پہلے ہی رضیہ جنید ان کے گھر موجود ہوتی تھی اور وہ ساری شام اس کے ساتھ بیڈ منٹن کھیتے ہوئے گزارتا۔ وہ ایک بہترین پلیئر تھی۔ منگے ترین ہونٹوں میں کھانا اور بڑے بڑے شاہجگ پلازہ سے شاہجگ کرنے کا کریز تھا۔ وہ ایک کلب بھی جو ان کر چکی تھی۔ وہ ابھی تک کوشش کے باوجود اسے اپنی راہ پر نہیں لاسکا تھا۔ کچھ مانوا اور کچھ منوانے کے اصول پر عمل کرتے ہوئے وہ اس کا ہر اس جگہ پر ساتھ رہنے کی کوشش کرتا جس کا اسے جنون کی حد تک شوق تھا لیکن وہ اس کی بات کو ہمیشہ ہاتھ جھٹک کر اڑا دی۔

”پلیئر زری تمہارے جسے انسان کے منہ سے ایسی باتیں سوٹ نہیں کرتیں۔“ اور وہ اپنا سر تھام کر رہ جاتا۔ لیکن اسے پایا کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو نبھانا تھا۔ لیکن اس سے بھی پہلے دل ہی دل میں اپنی ماں کے ساتھ کئے گئے عہد کو نبھانا زیادہ ضروری تھا اور وہ جو بات دل میں ٹھان چکا تھا اس پر عمل درآمد کرنے کا یہی مناسب وقت لگا تھا اسے۔

آج چھٹی کا دن اس نے بھرپور طریقے سے گزارا تھا۔ فجر کی نماز پڑھ کر سوئی تو دن چڑھے ہی اٹھی پر تکلف سے ناشتے کے بعد اس نے گھر کی صفائی کرنے کا سوچا اور پھر جٹ گئی۔ اماں کو شاید آج ہی کسی کے کپڑے سلائی کے دینا تھے اس لئے وہ مسلسل سلائی میں مصروف تھیں۔ مکمل صفائی سے فارغ ہو کر اس نے ابلی ہوئی چنے کی دال کو تڑکا لگایا اور چاولوں کو دم دے کر خود نہانے کے لئے ہاتھ روم میں ہنس گئی۔ اتنے میں اماں بھی اپنے کام سے فارغ ہو گئیں تھیں۔ وہ ہاتھ روم سے نکلتے ہی سیدھی کچن میں گئی پیاز کے باریک کچھے بنائے دھنیے اور پودینے کی چٹنی کی پلیٹ میں پیچ رکھ کر برآمدے میں رکھی ٹیبل پر کھانا

”تو کون سا فارغ بیٹھ کر آتی ہے جو تجھے آتے ہی چولہا جھونکنے پر لگا دیا کروں۔“ گھر کا کام تو ویسے بھی جو دوڑ کیا سلائی سیکھنے آتی ہیں۔ جھٹ پٹ کر دیتی ہیں دو بندوں کا کام ہی کتنا ہوتا ہے۔“ وہ ابھی بھی دھنیا صاف کرنے میں لگی تھیں۔

”دیکھ لیں آبی اماں کو میں نے منع بھی کیا ہے کہ اب یہ سلائی کڑھانی کے عذاب سے جان چھڑائیں ساری زندگی یہی مصیبتیں جھیلنے گزر گئی ہے اب تو کچھ آرام کر لیں میری تو یہ سستی ہی نہیں ہیں۔“

”ارے لگی اب میں کہاں سلائی کرتی ہوں بچیاں بیچاری سیکھنے آ جاتی ہیں اور پھر جن لوگوں کے اتنے برس کپڑے سیئے ہیں بہت بھروسہ کرتے ہیں ایک دم سے تو ان کو منہ توڑ جواب نہیں دے سکتی ناں۔“ انہوں نے دھنیا سالن میں ڈالا۔

”اچھا چلیں بس کر س، آپ اپنی بیٹی کو لے جائیں اور آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں میں اتنی دیر میں پھلکے اتارتی ہوں۔“

”کھانا ادھر برآمدے میں ہی لگا لینا شہزاد بھی آئے گا راحیلہ کو لینے سب اکٹھے ہی کھالیں گے۔“ وہ کہتی ہوئیں باہر نکل گئیں اور وہ ”جی اچھا“ کہہ کر مہارت سے روٹی بنیلے لگی۔

آج وہ خود کو بہت ریلیکس فیل کر رہا تھا۔ جس کاروبار کو بڑھانے میں اس نے دن رات محنت کی تھی وہ اب ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا تھا۔ وہ آج ہی چار روز کے دورے سے بیرون شہر سے واپس آیا تھا۔ اس کا یہ ٹور تو قلع سے زیادہ کامیاب رہا تھا۔ سب نے اسے بہت بہت مبارکباد پیش کی تھی۔ اس کی اس کامیابی کا سننے ہی رضیہ جنید نے ایک زبردست ٹریٹ کا مطالبہ کر دیا تھا اور اس نے اسے پی سی میں ڈنر کے ساتھ ساتھ ڈھیروں شاہجگ بھی کروائی تھی۔ ہر ویک



لگایا۔ ”بس اماں جلدی سے آجائیں، اب مزید صبر نہیں ہوتا۔ چوہوں نے پیٹ میں ریس شروع کر دی ہے۔“ اس نے بالوں میں لپٹا تولیہ اتار کر کرسی کی پشت پر ہی پھیلا دیا اور بیٹھ گئی۔ ”میں تھوڑی دیر بعد کپڑے دینے جاؤں گی ہو سکتا ہے مجھے کچھ دیر ہو جائے۔“

”اچھا“ وہ جلدی جلدی کھانے میں مصروف تھی۔

”کیا ہو گیا ہے تجھے آرام سے کھا۔“

”اماں بہت بھوک لگی ہے، ایک ہی تو دن ہوتا ہے جب نمل آزادی ہوتی ہے وہاں تو بس کچھ مت پوچھیں ایم ڈی صاحب کو تو اپنے بزنس کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔“

”اور تیرا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔“

ایک دن بھی ٹک کر نہیں بیٹھی گھر میں۔

”لیکن اماں ذرا یہ بھی تو سوچو کہ اگر میں گھر کے کام نہ کروں تو کل کو بدحرام اور پھوہڑ کھلوائی جاؤں گی اور میری اتنی سکھڑ اماں کی بدنامی ہوگی جو مجھے منظور نہیں ہے۔“ آج وہ خاصے فریش موڈ میں تھی اور ایسا بھی کبھار ہی ہوتا تھا۔

”اچھا زیادہ مسکے نہ لگا اور یہ برتن سمیٹ لے۔“ اس نے برتن سمیٹے اور پچن میں چلی گئی اور جب واپس آئی تو چائے کے دوگ اس کے ہاتھ میں تھے۔

”چائے کچھ زیادہ نہیں پینے لگی تو۔“

”افس میں اتنی سرکھپائی کے بعد چائے بھی نہ پیوں تو پھر میں تو گئی کام سے۔“

”اچھا اگر لیٹنا ہو تو کنڈی لگا کر لیٹنا میں جا رہی ہوں۔“ وہ کپڑے طے کر کے شاپروں میں ڈالتے ہوئے اسے نصیحت کر رہی تھیں۔

”آپ کو زیادہ دور جانا ہے تو رکشہ لے لیجئے گا۔“ اس نے بھی دروازہ بند کرتے ہوئے ہدایت جاری کی اور اندر آ کر کھلے بالوں کو برش

کر کے ہلکی پھلکی چٹیا بنا کر بینڈ لگایا اور پھر بہت ریلیکس موڈ میں لیٹ کر ٹیکے کے نیچے رکھا میگزین نکالا اور ورق گردانی کرنے لگی اور نجانے کب اس کی آنکھ لگی جو کہ مسلسل ہوتی دستک پر ہی کھلی تھی۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ شاید اماں آگئیں تھیں اس نے دوپٹہ شانے پر لٹکایا اور باہر آگئی لٹوں کی صورت میں بکھرے چھوٹے چھوٹے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹتی آگے بڑھی اور ”کون“ پوچھنے کے ساتھ ہی دروازہ کھول دیا اور وہی آنکھیں جو کھلنے میں ہی نہ آ رہیں تھیں اماں کی بجائے سامنے کھڑی شخصیت کو دیکھ کر پھٹ پڑیں۔

”سر! آپ۔“ اس کی حیرتوں میں ڈوبی آواز ابھری۔

اور وہ بھی تو حیرت سے گنگ کھڑا تھا وہ جو اس کا باپ تھا! حزم حسن گیلانی اس کی کمپنی کا ایم ڈی۔ جس سے وہ ہر روز ملتی تھی ہر دوسرے منٹ اسے اس کے آفس میں جانا پڑتا تھا اور وہ بالکل بھی نہیں گھبراتی تھی بہت اعتماد سے بات کرتی تھی۔ لیکن آج اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے دیکھ کر وہ بری طرح حواس باختہ ہوئی تھی۔

”سر! آپ یہاں کیسے۔“ اس نے تیزی سے سر پر دوپٹہ جماتے ہوئے پوچھا تو وہ چونکا۔

”آ..... آپ..... یہ گھر۔“ اس نے اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ادھر ادھر دیکھ کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور پھر جیسے وہ سنبھل گیا تھا۔

”کیا یہ عبدالمبین صاحب کا گھر ہے۔“ اس نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”جی سر!“

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔“ اس نے اپنے معمول کے انداز میں پوچھا۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا کہے لیکن پھر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔



”ان کو تو اس دنیا سے رخصت ہوئے دو سال ہونے کو آئے۔“

”اومانی گاڈ!“ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا چند لمحے وہ یونہی خاموشی سے بیٹھا رہا اور پھر نفی میں سر ہلانے لگا۔

”بہت برا ہوا بہت برا، کیسے بتاؤں گا میں انہیں۔“

”اُف۔“ اس کی حالت بتاتی تھی کہ اسے بہت دکھ پہنچا ہے۔ ریمیل آنکھوں میں حیرانی سمیٹے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کسے بیٹا! اور کون ہو تم کیسے جانتے ہو بابا کو؟“ ان کے پوچھنے پر وہ چند لمحے خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر جب بولا تو اس کی آواز بہت گہرائی سے آئی محسوس ہوئی۔

”میں..... آنٹی..... میں۔“ وہ جیسے بول نہ پاتا تھا۔

”میں احزم حسن، احمد حسن گیلانی کا بیٹا! آپ کی بہن کا سہیلی کا بیٹا، آپ کا بھانجا۔“ اماں حیرانی و بے یقینی سے اسے دیکھتی چلی گئیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔

”مم..... میرا بھانجا، سہیلی آپا کا بیٹا۔“ وہ اس کی طرف بڑھیں اور اس کا سراپے سینے سے لگالیا۔

”میرا بچہ، میرا احزم۔“ اماں کے آنسو مسلسل جاری تھے۔

”اتنا بڑا ہو گیا۔“ انہوں نے ماتھا چوما کندھے اور بازوؤں کو ٹٹولا اور اس کا لمبا چوڑا وجود اپنے ناتواں بازوؤں میں بھرنے کی ناکام کوشش کی اور وہ بھی تو اس وقت بالکل معصوم بچہ لگ رہا تھا۔ جب کہ ریمیل ایک شاک کی کیفیت میں کھڑی تھی۔

”اتنے برسوں بعد کیسے ہماری یاد آ گئی، آپا کہاں ہیں وہ تو ہمیں بھول ہی گئی پلٹ کر خبر ہی

”آئیے۔“ وہ اسے لئے اندر آ گئی۔ ”بیٹھے سرائے“ اس نے برآمدے میں رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”خیریت سرائے! آپ خود یہاں.....“ وہ ابھی تک بوکھلائی ہوئی اور پریشان تھی۔ جب کہ اس نے بہت پرسوج نگاہ اس پر ڈالی۔

”کیا راشدہ بی بی یہی رہتی ہیں۔“ ”جی سرائے! لیس، لیس سر یہیں رہتی ہیں۔“

”تو آپ یہاں.....“ ”راشدہ بی بی میری مدر اور عبدالمتین میرے نانا ہیں سرائے! لیکن آپ یہ سب.....“

”او آئی سی۔“ اس نے ہونٹ سیکڑ کر ایک طویل سانس خارج کی بھی اسی لمحے دروازے پر کھٹکا ہوا اور اماں اندر آ گئیں۔

”ریمیل کون آیا ہے، باہر اتنی بڑی گاڑی کھڑی ہے۔“ اماں نے پھولے ہوئے سانسوں سمیت چھوٹا سا صحن عبور کرتے ہوئے پوچھا اور

پھر ان کی نظر سامنے ہی براجمان شخص پر جم گئی۔ ”اماں یہ.....“ لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”السلام وعلیکم!“ اس کے سلام کا جواب ان کی حیرانگیوں کی نظر ہو گیا۔

”کون ہو تم بیٹا!“

”آنٹی میں، مجھے عبدالمتین صاحب سے ملنا ہے۔“ اس نے رک رک کر بغور ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کتنی مشابہت تھی ان کی ماما کے ساتھ۔

اماں نے گہری سانس لیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا شاپر ایک طرف رکھا اور ریمیل کو پانی لانے کا کہا اور وہ بھی ابھی تک الجھنوں میں گری تھی پانی لینے چلی گئی۔

”تم نے بہت دیر کر دی ہے بیٹا! آنے میں۔“ ان کے کہنے پر اس نے اچنبھے سے ان کی طرف دیکھا جب کہ انہوں نے گلاس منہ سے لگا لیا۔



نہ لی۔ کس کس سے نہیں پوچھا میں نے اس کا کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا میں نے اسے۔ وہ مسلسل رورہی تھیں۔

”کیسی ہے وہ، وہ خود کیوں نہیں آئی؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہیں نانا جان اور آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ بہت اداس رہتی ہیں وہ۔“

”مجھے اس کے پاس لے چلو بہت جدائی سہ لی اس کی اب نہیں سہی جاتی۔ بابا کی طرف سے میں اس کے پاؤں پڑ کر معافی مانگ لوں گی بہت ناراض ہوگی ناں وہ ہم سے بس مجھے اس کے پاس لے چلو میں خود ہی منالوں گی اسے۔“

”چلیئے۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور انہیں ساتھ لگائے آگے بڑھ گیا اور وہ جو بالکل ساکت کھڑی ان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی چارپائی پر دھڑام سے بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ہی شاید جذبات کی رو میں بہہ کر اسے بھول گئے وہ بہت گہرا اور طویل سانس لے کر حواسوں میں واپس آئی تھی۔ وہ یہاں رہ کر بھی وہاں ہونے والے جذباتی منظر سے بخوبی واقف تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ اب اماں کی واپسی اتنی جلدی ممکن نہیں۔

اور واقعی ان کی واپسی بہت رات گئے ہوئی تھی اور جب سے آئیں بھی وہاں کی باتیں ہی کرتی جا رہی تھیں۔

”میرا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا آنے کو پر تیرے خیال سے چلی آئی ہوں ورنہ کتنا روکا تھا سنگی نے یہ بھی کہا کہ احزم جا کر لے آئے گا تجھے پر وہ سو گیا تھا مجھے تو ان کا ڈرائیور چھوڑ کر گیا ہے۔“ انہوں نے کہا تو اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے انہیں دیکھا لیکن وہ اپنی ہی رو میں بولے جا رہی تھیں۔

”یہ اتنا بڑا گھر ہے ان کا، لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی ہیں، کھانے والے دو ماں بیٹا لیکن ٹیبل بھری ہوئی تھی، کیسے راج کر رہی ہے آپا سونے

کی انگوٹھیاں، بالیاں اور اتنے موٹے موٹے کنکرن اور ایک ہم بدنصیب ہیں۔“ انہوں نے لمبی آہ بھری۔

”جنہیں کانچ کی چوڑیاں بھی نصیب نہیں۔“

”اماں کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“ اس نے انہیں ہلایا۔

”ہاں اور کیا کہوں، باپ کی لاج رکھ کر بھی بدنصیب رہی، ایسا لگتا ہے جیسے اس کے لئے کی گئی ساری بد دعائیں مجھے ہی لگ گئیں ہیں۔“

”اماں پلیر، یہ سب قسمت کے کھیل ہیں، ماں باپ بھی بھلا اولاد کو بھی دل سے بد دعا دیتے ہیں۔“

”اچھا چل سو جا ساری رات بیت گئی پتہ نہیں ہی نہ چلا۔“ انہوں نے کروٹ بدلی، لیکن آج آنکھوں میں نیند کہاں تھی دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں گم تھیں جب فجر کی آذانیں ہونے لگیں۔

صبح آفس جاتے ہوئے اس کے احساسات بہت عجیب سے تھے دل نہ جانے کے باوجود بھی وہ آفس چلی آئی تھی۔ لیکن صبح سے ایک پار بھی اس کے کمرے میں نہیں گئی تھی اس کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی اس کا دل پار بار ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ بلندیوں پر کھڑا شخص اس کا فرسٹ کزن تھا اور وہ خود کیا تھی اس کی ایک معمولی ملازمہ نجانے آنے والے وقت میں اس کا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہوتا۔ وہ کوشش کے باوجود بھی ابھی تک اپنے ہاتھوں کی لمرزش اور قدموں کی لڑکھڑاہٹ پر قابو نہ پاسکی تھی۔

”عبدال یہ فائلیں صاحب کے پاس لے جاؤ اور انہیں کہو کہ انہیں چیک کر کے سائن کر دیں۔“ وہ پہلے بھی دن میں کئی بار عبدال سے ایسے کام کرواتی تھی لیکن آج نجانے کیوں ایسے



کہتے ہوئے اسے کسی چوری کا سا احساس ہوا تھا۔  
لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”نہیں تم مجھے دو میں خود ہی لے جاتی ہوں۔“ وہ ہنسنے لگی۔  
”مے آئی کم ان سرا“ اس نے حسب معمول پوچھا۔

”اوئیں کم ان پلیز۔“ اس نے خوش اخلاقی کے ریکارڈ توڑے۔ وہ تھوڑا سا گھبرائی لیکن اگلے ہی لمحے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے مضبوطی سے قدم جماتی آگے بڑھی۔

”سرا! یہ کچھ فائلز ہیں انہیں چیک کر لیں اور یہ چند لیٹرز بھی ہیں۔ ان پر آپ کے سائن ہونے والے ہیں۔“ اس نے سپاٹ سے انداز میں کہتے ہوئے فائلیں اس کے سامنے رکھیں۔

”کیسی ہیں آپ؟“ اس نے ان کی ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔

”فائن سرا! سنجیدگی سے جواب دیا۔  
”اور آئی کیسی ہیں۔“ وہ مصروفیت کے

باوجود پوچھ رہا تھا۔

”وہ بھی ٹھیک ہیں سرا!“ اس کا انداز بدستور قائم تھا۔ کام ختم ہوتے ہی اس نے فائلیں میٹیں اور فوراً ہی واپس چلی گئی اور وہ جو اس سے کسی نئے رویے کی توقع کر رہا تھا اسے اس بے نیازی سے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ نا صرف آج بلکہ آنے والے دنوں میں بھی اس کی بے نیازی بدستور قائم رہی تھی بلکہ ان سات آٹھ مہینوں میں اس کے رویے میں جو کچھ تھوڑی سی نرمی آئی تھی وہ پھر سے مفقود ہو چکی تھی۔ اس کے اس قدر روڈ سے رویے کو دیکھتے ہوئے چاہنے کے باوجود بھی اس اجنبیت کی دیوار کو نہ گراسکا تھا۔

”ریمیل مجھے آج لیٹج ٹائم میں جانا ہو گا تم ایسا کرنا کہ یہ فائلز چیک کر کے اختر صاحب کے پاس بھجوا دینا آگے وہ جانے اور ان کا کام۔“  
مسز خان جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے بولیں

تھیں۔

”او کے میڈم!“

”اور وہاں اجزم کے کمرے میں جو فائلیں میں نے صبح بھجوائی تھیں وہ بھی لے آنا۔“ وہ کہتے ہوئے اسے ان فائلوں کی تفصیل بتانے لگیں۔

کام کی زیادتی کے باعث وہ اپنا ساتھ لایا ہوا لیٹج بھی نہ کر سکی تھی۔ کام کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو بھوک کا احساس بھی شدت سے جاگا تھا۔ ٹیبل پر بکھری چیزیں سمیٹ کر ایک سائڈ پرکیں پانی کا گلاس بھر کر ٹیبل پر رکھا اور لیٹج بکس کھول کر بیٹھ گئی ابھی پہلا نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور وہ اندر چلا آیا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”مسز خان؟“ اس کا انداز سوالیہ تھا۔

”سرا! وہ تو بریک ہوتے ہی چلی گئی تھیں۔“

اس نے آہستگی سے منہ ہلا کر بتایا تو اس کے اس طرح بولنے پر وہ مسکرا دیا۔

”او تو یہاں لیٹج ابجوائے ہو رہا ہے اس کا مطلب ہے میں بالکل صحیح وقت پر آیا ہوں۔“ وہ آگے بڑھ آیا۔

”مصروفیت کی وجہ سے میں بھی وقت پر لیٹج نہیں کر سکا۔ آگر آپ مائنڈ نہ کریں تو آپ کے ساتھ شیئر کر سکتا ہوں؟“ اس کے کہنے پر اس نے گڑبڑا کر لیٹجے نام پر اپنے سامنے رکھی چیزوں کو دیکھا۔ ایک پرائیوٹ ماس کی دال کے ساتھ دھبے اور پودینے کی چٹنی اور پرائیوٹ پر رکھی اچار کی ایک پھانک جو کہ وہ اب اس سے بہت فرمائش کر کے رکھواتی تھی کہ لیٹج کے بعد بیٹھے رہنے کی وجہ سے ہاضمہ خراب ہو جاتا تھا۔ شرمندگی کے باعث اس کے ماتھے پر نمی اتر آئی۔ لیکن وہ کرسی ٹھیسٹ کر بیٹھ چکا تھا۔

”پلیز آپ بھی بیٹھیں ناں۔“ اس کے کہنے پر وہ متذبذب سی بیٹھ گئی۔ اس نے پرائیوٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور آدھا توڑ کر اس کے سامنے



رکھ دیا اور نوالہ منہ میں لیتے ہی چٹا رہے لینے لگا۔  
 ”ویری ٹیسی، ہیو اے ناکس سچ، آپ بھی  
 کھائیں ناں۔“ اس کے کھانے کے دوران وہ  
 نچال دانتوں تلے دبائے بیٹھی تھی۔

”یقین جانیئے کھانا بہت مزے کا۔ مجھے مزہ  
 آیا۔ بہت شدت سے بھوک لگی تھی، تھینک یو  
 ویری سچ۔“ اس نے اپنے رومال سے ہاتھ اور  
 منہ صاف کرتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”یہ آپ کا ادھار رہا مجھ پر۔“ وہ مسکرا کر کہتا  
 ہوا نکل گیا۔ لیکن اس کی بھوک اب ختم ہو چکی  
 تھی۔ اس نے سچ بکس سمیٹا اور کرسی کی پشت  
 سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

وہ خالہ سے مل چکی تھیں بہت پیار اور محبت  
 سے ملیں تھیں وہ اس سے ان کی شخصیت سے  
 بہت انپیرس کیا تھا اسے۔ ان سے ملنے کے بعد  
 جو سب سے پہلا خیال اس کے دل میں آیا وہ یہ  
 تھا کہ۔  
 ”ہاں احزم حسن گیلانی جیسے انسان کی ماں  
 کو یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ناکس سو بر اور  
 کیئرنگ۔“ اور وہ اپنے خیال کے تحت خود ہی  
 چونک اٹھی تھی۔

”بیٹا! کسی دن آؤ نا ہمارے گھر؟“  
 ”آں..... وہ..... جی خالہ جان! لیکن ابھی  
 تو بہت مصروفیت ہے جب وقت ملا تو ضرور آؤں  
 گی۔“

”میں ایسا کروں گی کہ اتوار کو ڈرائیور کو بھیج  
 دوں گی تم دونوں اس کے ساتھ گاڑی میں آ  
 جانا۔“

”نہیں نہیں خالہ جان! جب بھی وقت ملا  
 ہم خود آ جائیں گے۔“ اس نے جلدی سے کہا  
 اماں چونکہ اپنی بیٹی کی مزاج آشنا تھیں اس لئے وہ  
 بھی بول اٹھیں۔

”نہیں آپا! اس کی ضرورت نہیں ہے میں

ریمل کو ساتھ لے کر چکر لگاؤں گی۔“  
 ”تو پھر ٹھیک ہے جلد آنا۔“ انہوں نے بھی

زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا۔  
 اس نے کہہ تو دیا تھا لیکن وہ یہ اچھی طرح  
 جانتی تھی کہ شاید وہ وہاں بھی نہ جاپائے گی۔

وہ میڈم کے ساتھ اس وقت اس کے آفس  
 میں تھی جہاں تمام افسران کی اہم میٹنگ پریڈکشن  
 کر رہے تھے وہ پچھلے ایک گھنٹے سے کوئی بڑا مسئلہ  
 حل کرنے میں مصروف تھے کہ جب انٹرکام کی  
 بیل ہوئی۔

”سر! مس رضیہ جنید تقریباً دس منٹ سے  
 ویٹ کر رہی ہیں اور فوری طور پر آپ سے ملنا  
 چاہتی ہیں۔“ ریسپشن کی بات سن کر اس نے  
 لب سٹیج لئے وہ ہمیشہ اس وقت آتی تھی جب وہ  
 کسی اہم کام میں مصروف ہوتا تھا۔

”اوکے انہیں دس منٹ بعد اندر بھیج  
 دیں۔“ اس نے کہہ کر ریسور کھا اور پھر سب کی  
 طرف متوجہ ہوا۔

”اوکے گاٹز، باقی ڈکشن پھر کریں گے۔“  
 اس نے اپنے سامنے رکھی فائل بند کی اور ہاتھ  
 میں پکڑے پین پر کیپ لگایا اور ابھی شاف وہاں  
 سے اٹھنے بھی ناپایا تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے  
 کھلا اور وہ اندر چلی آئی۔

”اوہ ورونی، میں ایک گھنٹے سے باہر تمہارا  
 ویٹ کر رہی ہوں لیکن تمہاری میٹنگز ہیں کہ ختم ہی  
 نہیں ہوتیں۔“ وہ کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے  
 ہوئے شروع ہو چکی تھی۔ اسے ایک دم ہی سبکی کا  
 احساس ہوا۔ لیکن جب تک سب لوگ چلے نہ  
 گئے وہ لب دبائے بیٹھا رہا۔ مرد حضرات تو اسے  
 کے لباس انداز پر نظریں جھکائے اس کے پاس  
 سے گزر گئے لیکن ریمل نے جاتے جاتے ایک  
 نظر اس پر ضرور ڈالی تھی۔

”روز! میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ



اول تو میرے آفس نہ آیا کرو لیکن اگر آنا ہو تو چلنے سے پہلے فون کر لیا کرو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ آفس میں کتنا ہارڈ ورک ہوتا ہے۔“ وہ شاید اپنے غصے پر قابو پا چکا تھا اس لئے سمجھانے کے انداز میں بولا۔

”آئی..... ڈونٹ کیئر۔“ وہ ایک ایک لفظ دبا کر بولتی ادا سے بولی۔

”بس اٹھو تم، ابھی میرے ساتھ چلو۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر اسے اٹھانے لگی۔

”مگر کیوں۔“ اسے اس افراتفری کی سمجھ نہ آئی۔

”میرے فرینڈز نے کلب میں ایک بہت بڑی پارٹی آرینج کی ہے میں تمہیں ان سب سے ملوانا چاہتی ہوں۔“

”سوری، آئی ڈونٹ ویسٹ داتا تم۔“

”واٹ، کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گے۔“

وہ چیخی۔

”نو۔“

”وائے۔“

”اس لئے کہ میں اس وقت آفس میں ہوں اور یہاں بہت کام ہے۔“

”دیکھو آفس ٹائم ختم ہونے والا ہے یہ ایک ایونگ پارٹی ہے کیونکہ نائٹ میں ان کی فلائیٹ

بانگ کانگ کی اور اس سے پہلے ہم سب فرینڈز مل کر خوب ہلا گلہ کرنا چاہتے ہیں اور میں ان سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں ساتھ ضرور لاؤں گی اور اب

تمہیں میرے ساتھ ضرور چلنا ہے۔“

”میں نے کہا نا کہ میں نہیں جاسکتا ابھی

ایک بہت اہم میٹنگ میں جانا ہے۔“ وہ اس کی طرف سے مکمل بے نیازی برتتے ہوئے ٹیبل پر

پھینکی چیزوں کو ترتیب دینے لگا۔

”اوکے ٹھیک ہے مت جاؤ تم۔“ وہ ناراض

ہی گویا ہوئی اور روٹھے سے انداز میں کرسی پر بیٹھ

گئی۔

”مجھے کچھ پیسے چاہئیں میں اپنے فرینڈز کے لئے گفٹ خریدتا ہے۔“ اور اسے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے مان جائے گی لہذا فوراً ہی اس کی ڈیمانڈ پوچھی۔

”ففتی تھاؤزنٹ۔“ اس نے بلا جھجک کہا

اس نے فوراً پیسے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے اور وہ اگلے منٹ جا چکی تھی۔

-----

وہ شام کو گھر پہنچی تو راحیلہ آپی کو سامنے دیکھ

کر اس کی سیاری تھکان جانی رہی۔ وہ ان سے باتیں کر رہی تھی جب کہ وہ خاموش بیٹھی صرف اس کی سستی رہیں ان کی اس حالت کو وہ کافی دیر سے

نظر انداز کر رہی تھی لیکن پھر یوتھ سے بنا نہ رہ سکی۔

”کیا بات ہے آئی کوئی میٹنگ ہے کیا؟“

”اوں، آں نہیں تو۔“ وہ جیسے چونکی تھیں۔

”پھر کیا بات ہے، آپ اتنی خاموش کیوں

ہیں؟“

”بس یونہی شاید تھکن کی وجہ سے بولنے کو

دل نہیں چاہ رہا۔“ انہوں نے پڑمردگی سے کہا۔

”پھر بھی آپی کوئی وجہ ہوگی۔“ اس کے

لہجے میں اصرار تھا۔ انہوں نے ایک نظر اس کی

طرف دیکھا اور گہری سانس بھر کر بولیں۔

”کاش ہمارا باپ کسی قابل ہوتا یا پھر کوئی

بھائی ہی ہوتا ہمارا۔“ انہوں نے یاسیت سے کہا۔

”کیوں کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“ اس کے

فکر مندانہ انداز پر جیسے وہ چونکی تھیں۔

”آں نہیں، لیکن جی تو چاہتا ہے ناں۔“

ان کے لہجے میں کمی کھل گئی تو وہ فوراً ہی انہیں

بہلانے لگی۔

”ارے چھوڑیں آپی، اللہ کے ہر کام میں

کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ اب آپ

یہی دیکھیں کہ اگر اماں کا کوئی بھائی ہوتا، لیکن پھر

بھی ہماری قسمت ایسی ہی ہوتی تو ہم کہاں جاتے

اماں کی بھانج تو ہمیں دوسرے ہی دن نکال گھر

Skorpio  
FriendsKorner



سے باہر کرتیں اور رہیں خالہ جان تو ان کا اپنا اپنا  
بڑا گھر ہے کہ ان کے سامنے اس ڈربے کی کوئی  
اہمیت نہیں تو اب یہ اماں کی ملکیت ہی ہونا۔“  
اس کی اتنی لمبی تقریر پر وہ مسکرا دی۔  
”ہاں واقعی اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی  
مصلحت ضرور ہوتی ہے۔“  
”تو بتا خالہ سے ملیں۔“ انہوں نے اشتیاق

سے پوچھا۔

”ہاں ملی تھی۔“

”پھر کیسی لگیں تمہیں۔“

”بہت اچھی اور بہت پیاری بھی۔“

”اور ان کا بیٹا؟“ انہوں نے شرارت سے  
پوچھا تو وہ گھور کر انہیں دیکھنے لگی۔

”اچھا چھوڑ میں تو مذاق کر رہی تھی۔“ وہ  
ہنسی۔

”میرا بہت دل چاہتا ہے ان سے ملنے کو  
لیکن اتنا وقت ہی کہاں ہوتا ہے کہ ان کی طرف  
جاسکوں۔“

”اور تم نہیں گئیں ابھی تک۔“

”ہیں اور آئی آئندہ ایسی بات مذاق میں  
بھی مت کیجئے گا، آپ کو معلوم ہے وہ انگریز  
ہے۔“ اس کے لہجے میں سختی اور سنجیدگی ایک ساتھ  
تھی۔

”ہاں اماں نے بتایا تھا شاید کوئی ولایتی سی  
لڑکی ہے ان کے کسی حسن کی بیٹی، لیکن تم کیوں  
نہیں گئیں ان کے گھر۔“ ان کی سوئی ابھی تک  
وہیں انگی تھی۔

”میں وہاں جا کر کیا کروں گی۔“

”بھئی کیا ان کا گھر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا  
اور پھر ایک ہی تو خالہ ہیں ہماری اتنے برسوں بعد  
ملیں ہیں تو ہمیں اب ان سے چاہیے چلو خیر  
دونوں اکٹھے چلیں گے۔“

”نہیں میں ابھی نہیں جاؤں گی۔“

”کیوں پھر کب جاؤ گی۔“ انہوں نے

اچنبھے سے پوچھا۔  
”ان کے بیٹے کی شادی پر۔“  
”کیوں بھئی اس میں تمہارا خاص حکمت

ہے۔“

”دیکھنا چاہتی ہوں کہ ہر وقت جینز اور  
شرٹ اور دوسرے یہودہ مغربی لباس پہننے والی  
مشرقی لباس میں کیسی لگتی ہے۔“

”کیوں کیا تم نے دیکھا ہے اسے۔“  
”ہوں، نن..... نہیں تو۔“ وہ گڑبڑائی۔

”اماں نے بتایا ہے یاں۔“ وہ نظریں چرا

کر بولی اور وہ انہیں کیا بتاتی کہ وہ تو ہر دوسرے  
دن اس سے ملتی تھی۔ ہمیشہ ٹیڑھا سا منہ بنا کر وہ  
اس کے متعلق پوچھتی تھی۔

”کیا زوجی آفس میں ہے۔“ اس کا شامل

یاد آتے ہی وہ ہنس دی۔

”تمہیں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں بس یونہی ایک بات یاد آ گئی

تھی۔“ اس کے کہنے پر انہوں نے محبت سے اس

کے ہاتھ تھام لئے۔

”بھئی رہا کرو بہت پیاری لگتی ہو۔“ اس  
نے بھی اپنا دوسرا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر رکھا تو  
اگلے ہی لمحے چونک سی گئی۔

”ارے آئی آپ کے ہاتھوں کو کیا ہوا؟“

وہ ان کے کٹے پھٹے کالے کالے بد رنگ سے  
ہاتھوں کو ٹٹولنے لگی۔

”آئی! اتنے خوبصورت تھے آپ کے

ہاتھ، آپ کو معلوم ہے ناں کتنے پسند تھے مجھے یہ

ایسے کیوں ہو گئے ہیں۔“ وہ حیرت و پریشانی سے

ان کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ

رہا تھا کہ شادی سے پہلے دودھیا رنگت کے

مرمریں انگلیوں والے یہ وہی ہاتھ ہیں جنہیں

دیکھتے ہی دل ان کو تھام لینے کو چل اٹھتا تھا۔

”کچھ نہیں بھئی یہاں کام ہی کتنا ہوتا تھا،

تین عورتوں کا مل بانٹ کر کر لیتی تھیں، لیکن وہاں



تو سارا مجھے ہی کرنا پڑتا ہے گھر کی صفائی ستھرائی  
برتن دھونا اور کپڑے دھونا جو سب سے مشکل  
ہے۔

”آپ کیا ہاتھ سے دھوتی ہیں کپڑے؟“  
”ہاں تو اوپر کیا، میرے باپ نے کون سا  
واشنگ مشین دی تھی مجھے جینز میں۔“ وہ خچی سے  
بولیں۔

یہ جانے بغیر اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا  
تھا۔ وہ ایک ٹک انہیں دیکھے گئی اس کی حالت  
دیکھ کر انہیں فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔  
”آئی ایم سوری ریمیل میرا یہ مطلب نہیں  
تھا۔“ وہ رودی۔ اب وہ پچھتا رہی تھیں ایسی بات  
کہہ کے۔

”مجھے معاف کر دو میری بہن یہ میری نہیں  
میری ساس ہے جو ہر وقت یہ طعنہ دیتی رہتی  
ہے۔ گھر میں پانچ مردوں کے علاوہ ہر مہینے میں  
پندرہ دن آکر رہنے والی میری نند اور اس کے  
بچے اور ساتھ ساتھ اس کے شوہر کے کپڑے دھونا  
بھی میری ذمہ داری ہے۔ بقول ان کے وہ خود  
بوڑھی ہو چکی ہیں اور بیٹی مہمان۔“ انہوں نے  
نخوت سے کہا اور ان کی ساس کتنی بوڑھی ہیں وہ  
بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ایسی بے حسی پر کڑھ  
کر رہ گئی۔

”تو شہزاد بھائی ہو کچھ نہیں کہتے کیا؟“  
”کیا کہیں وہ کیا کر سکتے ہیں وہ بھی ذرا سی  
تھکن کا اظہار کروں تو ہزاروں طعنے سننے پڑتے  
ہیں اور وہ تو صبح کے گئے شام کو لوٹتے ہیں۔“ وہ  
روتے ہوئے بتانے لگی اور اس نے انہیں بولنے  
دیا تاکہ وہ اپنے دل کا تمام بوجھ اتار لیں۔

”آئی آپ چند دنوں کے لئے یہاں کیوں  
نہیں رک جاتیں جب سے شادی ہوئی آکر  
شہر میں ہی نہیں ہیں آپ۔“ جب وہ اچھی طرح  
بہنادل ہلکا کر چکی تو وہ بولی۔

”کیسے رہ سکتی ہوں میں یہاں یہ تو ان کی

مہربانی ہے جو ملوانے کے لئے آتے ہیں  
درنہ حالات کہاں اس کی اجازت دیتے۔“ وہ  
افسردگی سے بولیں۔ لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی اس  
لئے جب شہزاد بھائی آئے تو اس نے خود راحیلہ  
کے رک جانے کی فرمائش کی۔  
”پلیز صرف ایک ہفتہ شہزاد بھائی۔“ وہ  
لجاجت سے بولی۔

”نہیں ریمیل میرے یہاں رہنے سے  
گزارہ نہیں ہوگا اور ویسے بھی میں کپڑے لے کر  
نہیں آئی۔“ ان کی بجائے آئی نے کہا۔  
”آپ چپ کریں اور کپڑوں کی فکر مت  
کریں، میرے پہن لیجئے گا۔“ اس نے کوئی بھی  
عذر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو آخر کار شہزاد کو  
اکیلے ہی واپس جانا پڑا۔

اور پھر وہ جو کہ آفس اکاؤنٹ سے ضرورتاً  
ہی پیسے نکالوا رہی تھی، اگلے ہی دن دس ہزار روپیہ  
نکالوا لائی۔ آئی کو اس نے اپنے وہ سارے کپڑے  
دے دیئے تھے جو کہ تھے تو نئے ہی لیکن وہ آفس  
بہن رہیں جاتی تھی اور گھر میں پہننے کا اسے ہانم  
نہ ملتا تھا۔ آئی اور شہزاد بھائی کے لئے دو دو نئے  
سوٹ اور ایک بہترین سا سوٹ ان کی ساس کے  
لئے خریدا اور واشنگ مشین خریدنے کے لئے  
اسے تھوڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا بہر حال یہ  
پہاڑ بھی اس نے سر کر لیا۔ ان سب چیزوں کے  
ہمراہ وہ گھر پہنچی تو آئی نے کپڑے دیکھ کر تو کچھ نہ  
کہا لیکن جب واشنگ مشین کی کپنی والوں کی  
گاڑی دروازے پر آئی تو وہ سر تھام کر رہ گئیں  
لیکن آخر کار ان کی بہت سی سخت سست سننے کے  
بعد اس نے انہیں منالیا۔ ایک ہفتہ گزرنے کا پتہ  
بھی نہ چلا تھا۔ راحیلہ آئی تو خالی ہاتھ تھی لیکن  
جب لدی پھندی گھر پہنچی تو ساس جو کہ اس کے  
اتنے دنوں وہاں رہنے پر بھری بیخیں تھیں اتنا  
کچھ دیکھ کر کھل اٹھیں لیکن اپنے ظرف کے مطابق  
کہنا نہ بھولیں۔



”ہونہ، کیا ہوا جو دے دیا، اپنی بیٹی کو ہی دیا ہے تا سب کچھ میرے لئے تو یہ سستا سا سوٹ ہی ہے۔“

مسز خان کا بیٹا بیمار تھا اس لئے وہ دو دن کی چھٹی پر تھیں۔ کام کا سارا بوجھ اس پر تھا جسے وہ بڑی حاشاشانی سے کم کرنے کی سعی میں مصروف تھی کہ جب انٹرکام کی بیل بجی تھی۔

”مس زیدی آپ ذرا میرے آفس آئیں پلیز۔“ یوں تو وہ دن میں نجانے کتنی بار اسے طلب کیا کرتا تھا لیکن اس وقت اس کے لہجے میں ایک غیر معمولی پن تھا۔ وہ ریسور رکھ کر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے جیسے ہی دروازے کے پاس پہنچ کر ہلکا سا ناک کیا وہ خود بخود کھل گیا۔

”آئیے مس زیدی!“ ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہی ہاتھ کے اشارے سے اسے اندر آنے کو کہا گیا تو وہ اس سیشل پروٹوکول پر گھبراس گئی۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی اس نے پیچھے سے دروازہ بند کیا اور اس سے پہلے ایک سائیڈ پر دروازے کی صورت میں رکھے صندوق کی طرف بڑھا۔

”آئیے۔“ سینئر ٹیبل پر انواع و اقسام کے کھانے سجے تھے۔

”میرے ذمے ایک ادھار تھا آپ کا وہ آج چکانا چاہتا ہوں۔“ اس کے ہونٹوں پر پر خلوص مسکراہٹ تھی۔

”کیا مطلب سر!“

”ایک دن آپ نے مجھے لُنج کروایا تھا اور آج میں آپ کو کرواؤں گا۔ کیونکہ میں ادھار رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بہت نرم لہجے میں کہا تھا لیکن اس کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا کہ آخر وہ بھی تو اس کی مقروض تھی۔

”آئیے نا آپ ابھی تک وہیں کھڑی ہیں۔“

”آئی ایم سوری سر! میں آپ کے ساتھ لُنج نہیں کر سکتی۔“ اس نے قطعی انداز میں کہا۔

”نو اس وقت نہ میں آپ کا باس ہوں اور نہ آپ میری ماتحت اس وقت ہم صرف کزنز ہیں۔ اس وقت بھی اس کا لہجہ بہت سادہ اور پر خلوص تھا۔ لیکن وہ اپنی جگہ پر جمی تھی۔

”آئیے نا پلیز کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

”میں نے کہا نا سر میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

اسے رہ رہ کر اپنی کم مائیگی کا احساس کچوکے لگا رہا تھا لیکن وہ کسی بھی قیمت پر خود کو حقیر ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”لیکن کیوں؟“

”کیونکہ میں اسے مناسب نہیں سمجھتی۔“

اس کا انداز قطعیت لئے ہوئے تھا۔

”کیوں مناسب نہیں سمجھتی آپ اسے؟“ وہ

حیران تھا وہ تو اپنے ان خونی رشتوں کو پھر سے

استوار کرنا چاہتا تھا اور بس تو پھر وہ کیوں گریزاں

تھی وہ سمجھ نہ پا رہا تھا۔ وہ اس کے سوال پر

خاموش کھڑی تھی۔

”دیکھیں ریمیل آفس ورک کے علاوہ بھی

ہمارے کچھ ریلیشنز ہیں۔“ اس کا انداز ناصحانہ

تھا۔

”لیکن میں ”آفس“ میں اسی قسم کے

ریلیشنز انورڈ نہیں کر سکتی، اور میرا خیال ہے کہ

آئندہ آپ بھی اس بات کا خیال رکھیں گے۔“

اس نے مستحکم لہجے میں کہا اور واپس مڑ گئی۔

”لیکن ریمیل!“ اس نے اسے روکنے کی

کوشش کی۔

”ریمیل نہیں مس زیدی کے نام سے پکاری

جاتی ہوں میں آفس میں۔“ وہ مڑے بغیر رگی تھی

اور اپنی بات کہہ کر تیزی سے نکل گئی۔ اس نے

گہری اور طویل سانس چھی تھی۔

”عجیب لڑکی ہے۔“

وہ اس کے نہ سمجھ میں آنے والے رویے پر



تھی۔

”اماں خالہ نہیں آئیں کافی دنوں سے اور نہ آپ ہی نہیں ہیں ان کی طرف۔“ وہ آج جلدی گھر آئی تھی اور جانتی تھی کہ ان کو خالہ کے ذکر پر بہت خوشی محسوس ہوتی تھی۔

”ہاں دن تو کافی ہو گئے، تو فون کر کے پتہ تو کر۔“

”اماں پی سی او یہاں سے کون سا دور ہے۔ آپ خود جا کر فون کر لیں اس طرح آپ کی تسلی بھی ہو جائے گی۔“

”اچھا تو لا دے میری چادر میں ابھی فون کر آئیں ہوں۔“ وہ تو جیسے تیا ہی بیٹھی فوراً سبزی ایک سائیڈ پر رکھ کر اٹھ گھڑی ہوئی اور پھر نتیجہ توقع کے عین مطابق تھا۔

”احزم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ڈاکٹر گھر دیکھنے آیا تھا اسے۔“ اماں کے پر تشویش لہجے پر وہ ہنس دی۔

”اماں یہ تو امیر لوگوں کے چونچلے ہوتے ہیں وہ فوراً ڈاکٹر کے پاس جانے کی بجائے اسے گھر بلا لیتے ہیں ڈبل فیس دے کر۔“

”اچھا چل زیادہ باتیں نہ بنا اور اٹھ کر تیار ہو ہم ابھی جا میں گے اسے دیکھنے۔“ اماں کے کہنے پر ایک بھر پور انگڑائی لی اور وہی دروازہ ہو گئی۔

”آئی ایم سوری اماں بہت تھک گئیں ہوں میں۔“ اس کے جواب پر انہوں نے گھور کر اسے دیکھا اور کپڑے بدلنے اندر چلی گئی۔ اور پھر اکیلی ہی بہن کے گھر چلی گئیں۔

”ریمل کا کیا سوچتی ہو آیا وہ تو ہو بہو تمہاری کاپی ہے۔ اپنی منوانے والی ڈٹ جانے والی اور بھی نہ جھکنے والی اور خود دار ایسی کہ تم یقین نہیں کرو گی۔“

وہ ابھی ابھی وہاں آ کر بیٹھا تو آئی اپنی بیٹی

سوچ کر رہ گیا اس کے دل میں کوئی بھی ایسی ویسی بات تو نہیں تھی وہ تو محض اس تکلف کی دیوار کو ٹکراتا چاہتا تھا۔ لیکن جب وہ ہی ایسا نہیں چاہتی تھی تو پھر اس نے بھی زیادہ پروا نہ کی۔

آنے والے دنوں میں اس کا رویہ بھی اس کے ساتھ بہت قارل اور پروفیشن رہا تھا۔ لیکن کبھی بھی وہ اس کے سوچنے پر مجبور ہو جاتا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ بھولنے لگا تھا کہ ان کے درمیان آفس کے علاوہ بھی کوئی دوسرا تعلق ہے اس نے اگلے ماہ تنخواہ نکلوانے کی بجائے کمپنی اکاؤنٹ میں جمع کروائی اور باقی جمع شدہ رقم بھی اسی کھاتے میں ڈال کر تمام ڈاکومنٹس کلیر کر دیا کہ وہ قرض کے بوجھ سے آزاد ہو گئی تھی۔ اس طرح سے انہیں تھوڑی مشکل تو پیش آئی تھی لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھی۔

آج وہ آفس نہیں آیا تھا مسرز خان سے پتہ چلا کہ

”احزم کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں شام میں چکر لگاؤں گی اس کی طرف اگر تم بھی چلنا چاہو تو چلو۔“

”نو میڈم! تھینک یو، میں نہیں جا سکوں گی۔“

”ایک بات کہوں ریمل! ٹھیک کام کرنے اور زندگی گزارنے کے تمہارے کچھ رولز ہوں گے لیکن ایک جگہ کام کرتے ہوئے ہمیں تھوڑا ایک دوسرے کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور پھر باس کی نظروں میں جگہ بنانے کے لئے یہ سب کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر جانا نہ چاہو تو کم از کم فون ضرور کر لینا۔“ وہ اس کے لئے دیئے رتنے والے انداز سے اچھی طرح واقف تھیں اس لئے وہ کسی بھی نئی بات کو محسوس نہ کر پائیں تھیں اور ویسے بھی اس کا رویہ تو بالکل پہلے جیسا تھا بلکہ پہلے سے بھی نفاذ اور سخت اور وہ تقریباً سب کے ساتھ ایسی ہی



کی تعریفوں میں رطب السان تھیں۔ وہ اس کی مزاج پر سی کرنے اس کے کمرے میں گئیں۔ اس کا حال احوال پوچھ کر چند رسمی باتیں کرنے کے بعد وہ اس کے ڈسٹرب ہونے کے خیال سے یہاں لاؤنج میں آ بیٹھی تھی۔ جب کہ وہ خود بھی صبح سے لیٹ لیٹ کر اکتا گیا تھا اس لئے تھوڑی دیر بعد وہی چلا آیا۔

”باپ کا گھر تو اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں نانا کے گھر پیدا ہوئی کی بڑھی جوان ہوئی لیکن نانا سے کبھی ایک روپیہ بھی نہیں مانگا۔ اسے تو جیسے شروع سے ہی آگاہی تھی کہ نانا کا گھر اپنا نہیں ہوتا۔ شعور میں قدم رکھتے ہی اس نے ہمیشہ اپنا پڑھائی کا خرچا خود اٹھایا ٹیوشن پڑھائیں کمپیوٹر سینٹروں میں دھکے کھائے دن رات محنت کی لیکن کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ جب بابا فوت ہوئے تو اس وقت ایم اے کے پہلے سال میں تھی۔ ایک مزدور آدمی کی آمدنی ہی کتنی ہوتی ہے اور تم تو اچھی طرح جانتی ہو بابا کی کمائی کیا تھی جو ملا وہ کھالاکوئی جمع بچتی تو تھی نہیں۔“

”لیکن یہ بھی حقیقت ہے آپا کہ خدا کے بعد اس نے ہمیں سہارا دیا ہے۔ سورنہ.....“ انہوں نے بہت طویل اور گہری سانس لی۔

”راجیلہ کی شادی ایک بہت کڑا امتحان تھی میرے لئے اور اسے بھی آسان ریمیل نے ہی بنایا میں اس کے مزاج کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ نجانے کس طرح دفتر والوں کے سامنے ہاتھ پھیلا یا ہوگا اس نے۔“

اور اسے وہ دن اپنی پوری جزییات کے ساتھ یاد آیا تھا جب وہ پہلی بار اس کے آفس اپنی ایک کڑی ضرورت کے تحت آئی تھی جسے وہ بہت معمولی سمجھا تھا اور وہ تو اس کی حالت کو گھبراہٹ اور اعتمادی کمی پر معمول کر رہا تھا۔ لیکن اصل میں وہ اس کی انا و خود داری بھی جو اس کے سامنے اسے اپنا مدعا بیان کرنے سے روک رہی تھی۔

”اور اس قرض کو اتارنے کے لئے بھی اس نے جس طرح دن رات محنت کی ہے وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی اور پھر محنت کرنے والوں کا تو اللہ بھی ساتھ دیتا ہے اور اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب قرضہ بھی اتر گیا ہے اور نوکری بھی اچھی لگ گئی ہے۔ بس اب تو یہی خواہش ہے کہ کوئی اچھا سارشتہ مل جائے تو اس کی شادی کر دوں۔“ ان کی بات پر سلکمی بیگم کے ہونٹوں سے طویل اور گہری سانس برآمد ہوتی تھی۔ جب کہ وہ ان کی بات کو سن کر بھی سامنے سے آتی رضیہ جنید کو دیکھ کر دھیان نہیں دے سکا تھا۔

”ہائے ازجی ہاؤ آریو۔“  
”فائن۔“ کہتے ہوئے نجانے کیوں اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”تمہیں معلوم ہے کہ یہاں دو بزرگ خواتین بھی بیٹھی ہیں تمہارا فرض تھا کہ تم مجھ سے پہلے انہیں سلام کرنی اور پھر مجھے مخاطب کرتیں۔“ اس نے دھیمی آواز میں اسے سمجھانے کی سعی کی تو اس کی بات پر اس نے ابرو اچکائے۔

”سو واٹ، جب میں تم سے ملنے آئی ہوں تو پہلے تمہیں ہی ہیلو کہوں گی ناں، انی وے۔“  
”ہیلو آنٹی۔“ اس نے سلکمی بیگم سے کہا اور راشدہ بی بی کی طرف دیکھنے لگی۔

”اور یہ تمہاری وہی گمشدہ آنٹی تو نہیں۔“ اس کے لہجے میں لضحک کا عنصر نمایاں تھا کہ ان کا لباس و انداز ان کی مقلسی کا گواہ بنا ہر پل ان کے ساتھ تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اپر کلاس لوگوں کے انداز نہیں اپنا سکتی تھیں اور وہ خود حیرت استجاب سے منہ کھولے آدھے سے زیادہ عریاں ہوتے جسم کو دکھ رہی تھیں آپا نے اس کے متعلق انہیں بتایا تو تھا لیکن دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا تھا اور وہ ان کی ایسی نظروں کو محسوس کر کے چہرے پر ناگواری سجائے احزم کو وہاں سے اٹھا کر اس کے کمرے میں لے گئی جس سے ان کی



جرت مزید دو چند ہو گئی۔ سلی بیگم ان سے نظریں چرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آؤ راشدہ میرا خیال ہے کھانا لگ گیا ہے۔“ اور وہ دل میں بہت سے سوال لئے خاموشی سے اٹھ گئیں کہ آخر وہ بھی ایک بیٹی کی ماں تھیں اور وہ نہیں چاہتیں تھیں کہ ان کے سوالوں کو کہیں کسی اور ہی مطلب میں لے لیا جائے بے شک وہ اس کی ماں جانی تھی لیکن محل میں ٹاٹ کا پیوند تو نہیں لگ سکتا ناں، لیکن وہ ان کے ہر سوال کو ان کی آنکھوں میں پڑھ چکی تھیں۔

”تم حیران ہونا کہ میں نے اپنے اتنے ہونہار اور فرمانبردار بیٹے کے لئے ایسی لڑکی کا انتخاب کیسے کر لیا۔“

اس کے اس طرح بننے میں اس کا اپنا قصور نہیں ہے اس کی ماں انگریز عورت ہے۔ لیکن جنید بھائی بہت اچھے انسان ہیں۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ جنید بھائی نے ہر مشکل میں حسن کے ساتھ دوستی نبھائی ہے جس نے جب سوینی ماں کی مار کھا کر گھر سے بھاگے تو انہوں نے ہی انہیں سہارا دیا اور جب حسن نے مجھ سے شادی کی تو جنید بھائی ہی تھے جنہوں نے قدم قدم پر ہماری مدد کی اور آج جس مقام پر حسن کھڑے ہیں۔ وہ سب جنید بھائی کی بدولت ہے وہ بہت پریشان تھے اپنی بیٹی کے لئے اسے اس ماحول سے نکالنا چاہتے تھے۔ حسن سے ان کی یہ پریشانی دیکھی نہ گئی ورنہ اسے احزم کے لئے مانگ لیا اور حسن کا ہر فیصلہ مجھے اپنی ہر خواہش سے زیادہ مقدم ہے بلکہ شاید زندگی سے بھی بڑھ کر عزیز۔“ وہ نجانے انہیں کیا باور کرانا چاہتیں تھیں۔

صبح آفس پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اختر صاحب کو اپنے کمرے میں طلب کیا کہ جن کا تعلق فنانس ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔

”اختر صاحب! آپ ایسا کریں کہ مس

زیدی کی سیلری میں تھری تھاؤرنٹ کا اضافہ کر دیں اور انہیں یک اینڈ ڈراپ کی سہولت فراہم کریں اور ہاں ایک عدد سیل فون بھی مہیا کریں انہیں تاکہ بوقت ضرورت ان سے کانتیکٹ کیا جاسکے۔“ اس خالص پیشہ ورانہ انداز میں حکم صادر کیا۔

”اوکے سر۔“ لیکن ابھی چند ماہ پہلے ہی تو ان کی تنخواہ میں دو ہزار کا اضافہ کیا گیا ہے۔

”آپ سے جو کہا گیا ہے وہ کیجئے، دیش آل۔“ اگلی صبح جب وہ آفس جانے کے لئے گھر سے نکلی تو وردی میں ملبوس ڈرائیور گاڑی لئے کھڑا تھا اس نے اسے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔ اس نے ناچھی سے اس کی طرف دیکھا کیونکہ اس ابھی تک کسی قسم کی کوئی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔

”میڈم! اب میں آپ کو ہر روز یک اینڈ ڈراپ کرنے کے فرائض انجام دوں گا۔“ اس نے آواز بڑھائی۔

”کیوں؟“

”یہ ایم ڈی صاحب کا حکم ہے میڈم!“ اس کے جواب پر اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال بن گیا۔

”اور کس کس کو یہ سہولت دی گئی ہے۔“ یہ سوال پوچھنے کے لئے لب کھولتے کھولتے دبا گئی۔

”تم جاؤ ڈرائیور میں خود ہی آ جاؤ گی۔“

”لیکن میڈم!“

”میں نے کہا ناں جاؤ۔“ اس کے سختی سے کہنے پر وہ متذنب سا واپس چلا گیا۔

وہ آفس پہنچی تو مسز خان نے خوشدلی سے اس کا استقبال کیا اور پھر اسے تنخواہ میں اضافے کی خوشخبری سنا کر مبارکباد دی اور ایک سیل فون بھی اس کے حوالے کیا۔



وہ اتنی عنایات پر سر تھا جہاں کر بیٹھ گئی۔  
”آخر چاہتا کیا ہے یہ شخص؟“

”مہڈم! میں ذرا ایم ڈی صاحب سے مل کر ان کا شکریہ ادا کروں۔“ انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت لی۔  
”اتنی عنایات کا مطلب پوچھ سکتی ہوں سر!“ اس نے جاتے ہی موبائل پچھنے کی صورت میں اس کے سامنے رکھا تھا وہ جو اپنے کام میں منہمک تھا سزا اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور گہری سانس لیتے ہوئے پشت سے ٹیک لگائی۔  
”ہر کمپنی اپنے محنتی اور اچھے ورکرز کو سہولتیں پرووائیڈ کرتی ہے۔“ ڈرائیور نے چونکہ آتے ہی ساری رپورٹ پیش کی تھی اس لئے وہ لاشعوری طور پر اس صورتحال کے لئے تیار بیٹھا تھا۔

”لیکن مجھے کمپنی کے ملازمین سے ہٹ کر ایسی مراعات نہیں چاہئیں جو کہ مجھے آپ کی آمارت اور اپنی مفقوسی کم مائیگی کا احساس دلائیں۔ میری محنت کے عوض مجھے جتنی تنخواہ ملتی ہے میرے لئے اتنی ہی کافی ہے اور نہ ہی میں آفس سے بھی لیٹ ہوؤں ہوں کہ گاڑی کی ضرورت محسوس کروں اور آفس میں میرے ذمہ جتنا کام ہوتا ہے اور مجھے اپنے باقی وقتی مسائل کسی کی بھی مدد کے بغیر حل کرنا ہیں، آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ وہ اس طرح بولتی کہیں سے بھی روزانہ والی خاموش خاموش سر جھکا کر کام کرنے والی ”مس زیدی“ نہیں لگ رہی تھی۔ کسی کی عزت نفس اور خود داری پر چوٹ لگاؤ تو شاید وہ اسی طرح چپختا ہے۔

”اور پلیز آئندہ آپ مجھ پر اس قسم کے احسانات کر کے مجھے یہ احساس مت دلائے گا کہ آپ بہت اونچے اور میں بہت پستی میں کھڑی ہوں۔“ اس نے کہا مڑی اور تیز تیز قدم اٹھانی باہر نکل گئی اور وہ جو اسے سمجھانے کی غرض سے

اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کی طرف آیا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ ”مائی فٹ۔“ اس نے پورے غصے سے

ٹیبیل کو ٹانگ رسید کی۔ ”خود کو کوئی آفاقی چیز سمجھتی ہے شاید، میرا بلا سے جہاں مرضی دکھے کھانی پھرے۔“ با آواز بلند بڑبڑانے کے باوجود اس کا غصہ کم نہیں ہوا تو گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

تقریباً سات ماہ ہونے کو آئے تھے انہیں اپنے درمیان تعلق کی پہچان ہوئے لیکن آج بھی وہ پہلے ہی کی طرح اجنبی تھے اور ان سات ماہ میں کبھی مزید تین ماہ کا اضافہ ہو گیا لیکن اجنبیت ہنوز قائم تھی۔ لیکن اب وہ اسے انکور کرنے کی بجائے جھنجھلانے لگا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ اس کے رویے کو سوچنے پر مجبور ہو جاتا تو سوائے جھنجھلاہٹ کے کوئی سراہا تھا نہ آتا اور نہ جانے کس احساس کے تحت وہ رضیہ جنید کو زیادہ وقت دینے لگا اس کی ہر جانب ونا جاسزا خواہش بنا پس و پیش ماننے لگا تھا۔ شاپنگ کلب، پارٹیز ہر جگہ اس کا ساتھ رہتا۔ رات بھی ان کی واپسی تقریباً تین بجے ہوتی تھی کلب سے واپسی پر وہ روز کو اس کے اپارٹمنٹ میں چھوڑ کر خوبصورت اور خوشگوار موسم میں لانگ ڈرائیو کو انجوائے کرتا ہوا گھر پہنچا تھا اور اب سنڈے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سارا دن جی بھر کر سونے کے بعد وہ بھرپور سسٹی اور کاہلی سے بستر پر پڑا تھا۔ ویسے بھی ماما تو یہاں بھی نہیں جو اسے اٹھائیں وہ جب سے پاکستان واپس آئے ہیں ان کا یہ تیسرا چکر تھا جو وہ انگلینڈ لگا چکی تھیں اور ہر چکر دو مہینوں پر مشتمل ہوتا تھا وہ انتہائی بوریت محسوس کرتا تھا ماما کے بغیر پایا سے وہ بار بار کہہ چکا تھا کہ وہ وہاں سے بزنس وائسٹاپ کر پاکستان آ جائیں لیکن ان کا ہر بار یہی جواب ہوتا کہ بزنس اتنا پھیل چکا ہے کہ اتنی جلدی سے



”او میری پیاری اماں سبلے کہا ہوتا، چلیں ٹھیک ہے میں آپ کو کل ہی بالکل نیا موبائل فون لا کر دوں گی۔“

”چل ہٹ پرے نیا کیا ضروری ہے بات تو سکیٹڈ ہینڈ سے بھی ہو سکتی۔“

”ارے چھوڑ بھی اماں اب آپ کی بیٹی کوئی ایویس سی نہیں ہے، بہت کماؤ ہو گئی ہے فون بھی لیں گے فریج بھی اور کمپیوٹر بھی۔ ہاں تھوڑا وقت ضرور لگے گا لیکن انشا اللہ اس سال میری اماں کو نہ تو دوسروں کے گھروں سے برف لینے جانا پڑے گا اور نہ ہی فون سننے۔“ اس نے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر بڑے لاڈ سے کہا تو وہ اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر پھر منہ ہی منہ کچھ پڑھ کر اس پر پھونک دیا۔

”اچھا چل ٹھیک ہے، پر تجھے بتا دوں کہ اس مہینے کا سارا راشن ختم ہو گیا ہے کل وہ ضرور لے آتا۔“

”اچھا اماں ٹھیک ہے۔“ وہ صحن پر بھیجی چار پانی پر لیٹ گئی اور انگڑائی لیتی ہوئی بولی۔

ابھی وہ وہی لیٹی تھی کہ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا اس نے مسکراتے ہوئے کل گئے جانے والے کاموں کا ٹائم ٹیبل دیکھا اور ان پر عمل کرنے کا تہیہ کر لی ہوئی مغرب کے لئے اٹھ گھڑی ہوئی۔ صبح جب وہ سو کر اٹھی تو آسمان پر کالے کالے پادل تھے ٹھنڈی ہوا صحن کے ایک کونے میں لگے ابار کی سرخ سرخ کلیوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے پرست جھونکوں نے اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر بلا مقصد صحن میں چکراتی پھری ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد گھر کے کاموں میں اماں نے سچ تیار کیا تقریباً چار بجے کے قریب وہ بازار جانے کے لئے گھر سے نکلی تھی بازار پہنچنے سے پہلے ہی ہلکی ہلکی بوندا

سینا ممکن نہیں اور ویسے بھی انکا فی الحال ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے تھکے اٹھا کر پوری قوت سے پرے اچھالا اور سائیڈ ٹیبل پر لگا بین پیش کیا۔ دس منٹ بعد ہی ملازم چائے لے کر آ گیا۔ وہ چائے کی پیالی اٹھائے کھڑکی کی طرف آیا، ونڈو گلاسز میں سے باہر کا نظارہ اسے چونکا گیا کپ رکھ کر گلاسز کھسکائے اور جیسے ہوا میں تو اسی انتظار میں تھیں ٹھنڈ کی تیز لہر نے اس کے اندر سنسی دوڑادی۔ گزشتہ تین چار دنوں سے سردی کے اس شدید موسم میں ہی اچھی خاصی گرمی کا احساس ہونے لگا تھا لیکن رات سے موسم خوشگوار تھا اور اب تو اس کے تیوری بدلے ہوئے تھے۔ اس نے جلدی جلدی چائے کا کپ خالی کیا اور چار چھینٹے منہ پر مارے سیلنگ ڈریس سے نجات حاصل کی اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا، خوبصورت موسم کا وہ دیوانہ تھا اور لاٹنگ ڈرائیو اس کی کمزوری۔

”اُف سردی کے موسم میں ہی گرمی کا یہ حال ہے تو گرمیوں میں کیا حالت ہوگی۔“ اس نے آفس سے آتے ہی پسینہ صاف کیا۔ اماں نے فوراً گھڑے میں سے پانی ڈال کر پلا یا۔

”ہاں تین چار دنوں سے ایسا ہی لگتا ہے کہہ جیسے سچ مچ گرمی آگئی ہو۔“ اماں بولیں اس نے گلاس خالی کر کے ان کی طرف بڑھایا۔

”ہاں اماں اور میں سوچ رہی ہوں کہ اس سال کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ فریج بھی لے لیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے پر سب سے زیادہ ضروری تو فون لینا ہو گیا ہے بہت شرمندگی ہوتی ہے دوسروں کے گھروں میں جا کر فون سننے پر پہلے تو اتنی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن اب آپا اکثر فون کرتیں تو باتوں باتوں میں اس کی کا احساس ہونے لگتا۔“



باندی شروع ہو گئی جو کہ صبح سے ہی تھوڑے  
تھوڑے وقفے سے ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے کی تھکا  
دینے والی شاپنگ کے بعد بازار سے شاپنگ  
پہنچتے پہنچتے دھواں دھار بارش میں تبدیل ہو گئی  
تھی۔ وہ چند قدم پر ہی بھیگ گئی بس آتی لیکن  
شاید بارش سے بچنے کے لئے ساری دنیا اسی میں  
ہی سوار ہو گئی تھی اور بس شاپ پر جوا کا دکا مسافر  
کھڑے تھے وہ بھی پائیدان سے ٹک گئے۔ موسم  
کے تیور خطرناک صورت اختیار کرتے جا رہے  
تھے۔ اس نے رکشے، ٹیکسی کی تلاش میں ادھر  
ادھر نظر دوڑائی لیکن اتنی عام شاہراہ پر کوئی ذی  
روح نظر نہ آیا۔ اس کے ہاتھوں میں تھاپے  
بڑے بڑے شایر جو ایک سائیڈ پر رکھ کر کھڑی تھی  
دوبارہ اٹھائے اٹھائے اور چھوٹے چھوٹے قدیم  
اٹھائی کسی جائے پناہ کی تلاش میں نظر میں دوڑائی  
رہی۔ ہلکا سا کٹن کا سوٹ جس پر سیلیولیس سوئٹر  
پہنے ہوئے اور ہڈیوں کو چیرتی ہوا میں سردی کو  
روکنے کے لئے اس کا لباس ناکافی تھا۔ اس کے  
دانت مسلسل بج رہے تھے سردی کی شدت سے  
اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔

وہ کافی دور نکل آیا تھا جب برستی بوندوں  
نے طوفان باد و باراں کا روپ دھارا تھا۔ سردی  
کی شدت برداشت سے باہر ہونے لگی تو اس نے  
گاڑی کا ادھ کھلا شیشہ پورا بند کر دیا اور واپسی  
کے لئے گاڑی موڑ لی بارش کے قطروں کو صاف  
کرتے واپس مسلسل حرکت کر رہے تھے۔ تیز  
بارش اور تیز ہوائیں اور ایسے میں فٹ ہاتھ پر نظر  
آتا وہ نکتہ اس نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ بلیک  
کلر پر بڑے بڑے ریڈ ڈائس والا سوٹ پہنے سیاہ  
چادر اوڑھے یقیناً وہ وہی تھی۔ کیونکہ کل آفس میں  
اس نے یہی کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کی  
چادر بھیگ کر اسے کے ساتھ چپک گئی تھی۔ اس

کے قریب پہنچ کر اس نے ذرا سے بریک لگائی  
اور فوراً ہی فرنٹ ڈور کھول دیا۔ وہ شیشے پر بارش  
کے قطروں کی وجہ سے اندر بیٹھی شخصیت کو تو نہ  
دیکھ پائی تھی لیکن گاڑی پہچان چکی تھی۔ اس لئے  
وہ فوراً ہی فٹ ہاتھ سے اتر کر گاڑی کے آگے  
سے ہوتے ہوئے دوسری سائیڈ پر آئی اور بغیر کسی  
ہیل و جھٹ کے بیٹھ گئی۔ لیکن اتنی دیر میں ہی اس  
کی حالت بالکل غیر ہو چکی تھی۔ اس لئے بیٹھتے ہی  
سر سیٹ کی پشت سے لگا لیا۔ اس میں تو اتنی بھی  
سکت نہ تھی کہ اپنی طرف کا دروازہ ہی بند کر سکتی وہ  
اب تک نجانے کس طرح چلتی رہی تھی اور اس  
لمحے اس کی ساری انا و خود داری نجانے کہاں جا  
سوئی تھی۔ اس نے بغور اس کی طرف دیکھا اور  
ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر دیا گاڑی سٹارٹ  
کرتے ساتھ ہی اس نے ہیٹر آن کیا تھا اور گاڑی  
ڈرائیو کرتے بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔  
کیونکہ سردی کی شدت سے ہونٹ نیلے اور رنگت  
زرد ہو چکی تھی۔ گود میں رکھے لرزتے ہاتھ بھی اپنی  
رنگت چھوڑ کے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی بگڑتی حالت  
اسے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ وقفے وقفے  
سے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھنے کی کوشش کرتی  
لیکن کامیاب نہ ہو سکی تو یہ کوشش ترک کر کے  
دوبارہ پشت سے سر ٹھیک کر اپنے ارد گرد سے بے  
نیاز ہو گئی تو وہ گھبرا گیا۔

”یو آر آل رائٹ ریمل!“ اس نے اس کا  
کندھا ہلایا تو اس نے نیم وا آنکھوں سے اس کی  
جانب دیکھا اور پھر بند کر لیں۔ اس نے گاڑی کی  
رفتار بڑھانے کی کوشش کی لیکن دھواں دھار  
بارش اور گر جتے چمکتے بادلوں کی وجہ سے ایسا ممکن  
نہ ہو سکا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے موسم میں گاڑی چلانا  
خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ لہذا تھوڑی سی تلاش  
کے بعد اس نے گاڑی ایک دوکان کے شید کے  
نیچے کھڑی کر دی۔



آواز پیدا کر کے خاموش ہو گئی۔  
 ”اومانی گاڈ۔“ اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔ وہ باہر نکلا اور اسے لاک کر اندر چلا آیا۔  
 ایک کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن کچن سے برتنوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ وہیں چلا آیا۔  
 ”آئی! گاڑی خراب ہو گئی ہے کیا یہاں قریب کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔“

”نہیں بیٹا! ویسے بھی موسم کافی خراب ہے شاید کوئی ڈاکٹر نہ ملے اس وقت اس لئے رہنے دو تم بھی سارے بھیگ چکے ہو ایسا کرو میں تمہیں بابا کے کپڑے نکال دیتی ہوں انہیں بدل لو۔“ انہوں نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور کچن سے باہر آ گئیں۔ وہ بھی دوسرے کمرے میں ان کے پیچھے چلا آیا۔ جب وہ باہر نکلا تو اماں ٹرے میں چائے کے مگ رکھے ساتھ والے کمرے میں جا رہی تھیں۔

”ادھر ہی آ جاؤ بیٹا!“ ریمیل رضائی اوڑھے لیٹی تھی۔ انہوں نے ٹرے میز پر رکھی اور خود باہر چلی گئیں۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ اس کے پوچھنے پر وہ ”ٹھیک ہے“ کہہ کر خاموش ہو گئی اس نے اس کی طرف ایک نظر دیکھ کر کپ اٹھالیا۔ اماں گیس ہیٹر لے آئیں اور اسے چلا کر کمرے کے وسط میں رکھ دیا۔

”گھر میں اگر کوئی ٹیلیٹ ہو تو آپ وقتی طور پر وہ لے لیں۔“ جیسے ہی اماں نے کپ ریمیل کو تھمایا وہ بولے بنانہ رہ سکا۔

”اماں رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں گولیاں رکھیں ہیں وہ دے دیں مجھے۔“ انہوں نے گولیاں نکال کر ٹیبل پر رکھے جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیل کر اسے دیا اور خود بھی چائے کا کپ اٹھا کر اس کے برابر بیٹھ گئیں۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ بیٹا! کہ تم اس

ہیٹر کی وجہ سے گاڑی کا ماحول اچھا خاصہ گرم ہو چکا تھا اور شاید شدید ٹھنڈ کے بعد ایک دم سے گرمائش اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی تھی۔ نیم غنودگی کے عالم میں اسے پہلی بار پھینک آئی اور پھر دوسری پھر تیسری اس نے نشو و نما کا ڈبہ اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے آنکھوں میں آئے پانی کو صاف کر کے رگڑ کر ناک صاف کی لیکن پھر چھینکوں کا ایک سلسلہ تھا جو کہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ پہلے ہی ٹنڈال تھی مزید ٹنڈال ہو گئی۔ کچھ وقفہ آتے ہی اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح تیز چل رہی تھی۔ چھینکوں کے اس پیریڈ میں اس کے جسم کا منجمد خون گردش کرنے لگا تھا۔ نیلے ہونٹ سرخی میں ہو گئے اور چھوٹی سی ناک بار بار صاف کرنے کی وجہ سے قد رے گلابی ہو چکی تھی۔ بند آنکھوں پر لرزتی لمبی گھنی سیاہ پٹلیں وہ شاید آج پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا اور یہ لمحہ..... اس نے اس لمحے سے نظریں چرا کر گاڑی دوبارہ شارٹ کی اور سپیڈ بڑھا دی۔

گاڑی کا ہارن سنتے ہی اماں جو اس کی فلز میں کئی بار دروازے تک آ کر باہر دیکھ چکی تھیں اور پھر مایوس لوٹ کر برآمدے میں جا کھڑی ہوئیں باہر بھاگیں۔ اس نے گاڑی روکتے ہی اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور دوسری طرف آتے پوری طرح بھیگ گیا۔ اس نے فرنٹ ڈور کھولا ہی تھا کہ دروازے پر اماں نمودار ہوئیں۔

”جلدی کریں آئی ریمیل کی طبیعت کافی خراب ہے، آپ اسے لے کر اندر چلیں میں کسی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں؟“  
 انہوں نے ٹنڈال سی ریمیل کو سہارا دے کر ہر نکالا اور اندر لے گئیں۔

اس نے دوبارہ اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی شارٹ کرنے کی کوشش کی تو وہ گھر کی



مشکل میں ہمارے کام آئے۔“  
 ”کیسی غیروں والی باتیں کر رہی ہیں آنٹی!  
 آپ، میں تو ایسے ہی کھونے کی غرض سے گھر سے  
 باہر نکلا تھا کہ اتفاقاً ان پر نظر پڑ گئی۔ لیکن ایسے  
 خراب موسم میں آپ نے انہیں گھر سے جانے  
 کیوں دیا؟“

”کیا کریں بیٹا! مجبوری تھی پھر کون کرے  
 یہ سارے کام، پہلے تو میں خود ہی سب کچھ کر لیتی  
 تھی لیکن اب مجھ بوزھی جان سے کچھ نہیں ہوتا۔  
 بجلی کا بل، پانی، گیس کا بل، گھر کا راشن اور باقی  
 ہر ضرورت کے لئے اسے ہی جانا پڑتا ہے اور کیا  
 پتہ تھا کہ موسم اتنا خراب ہو جائے گا۔“

”لیکن آج تو سنڈے ہے سب بازار بند  
 ہوں گے۔“

”ہم پلازہ سینٹرز سے شاپنگ نہیں کرتے  
 ہم جیسے لوگوں کے لئے بازار سنڈے کو ہی لگتا  
 ہے۔“ اس کی باریک سی آواز پر اس نے اماں  
 سے پرے نظر کی وہ اپنی چائے ختم کر چکی تھی۔  
 اس کی بات پر اس کا شدت سے جی چاہ کہ وہ  
 اسے جھجھوڑ کر پوچھے کہ ”آخر تم اس قدر احساس  
 کمتری کا شکار کیوں ہو“ لیکن خاموش رہ گیا۔ وہ  
 محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس کی موجودگی میں لیٹنے  
 سے گریزاں ہے لیکن پھر اماں کے کہنے پر وہ ان  
 کی آڑھ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے گرد اچھی  
 طرح رضائی لپیٹ کر لیٹ گئی۔ اماں نے اس  
 کے چہرے پر آئے بالوں کو ہاتھ سے ہٹایا اور  
 ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پریشان ہو گئیں۔

”اسے تو بہت تیز بخار ہو گیا ہے۔“

ان کی بات پر وہ لب کاٹ کر کھڑا ہو گیا۔  
 ”میرا خیال ہے کہ بارش کچھ ٹھم گئی ہے میں  
 کسی ڈاکٹر کا پتہ کرتا ہوں۔“

”نہیں پلیز رہنے میں نے ٹیبلٹس  
 لے لیں ہیں تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی

آپ کو زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے  
 پہلے ہی آپ کو میری وجہ سے کافی تکلیف اٹھانا  
 پڑی ہے، آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ اس کی بات  
 پر اس کے لب پہنچ گئے۔

”میرا خیال ہے میں چلتا ہوں آنٹی! اب  
 میری یہاں ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور  
 تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

”ارے اسے کیا ہوا، میری بات سنو بیٹا!“  
 وہ تیزی سے اٹھ کر اس کے پیچھے پئی وہ برآمدے  
 میں آکھڑا ہوا۔

”نجانے یہ لڑکی اپنی کھوکھلی انا کا پرچم کب  
 تک بلند رکھے گی۔“ اس نے اپنے بوٹ کی ٹوہ  
 سے اکھڑے فرش کو ٹھوکر مار کر مزید اکھڑ دیا۔

”ایسے موسم میں کیسے جاؤ گے بیٹا! تم گاڑی  
 بھی خراب ہو گئی ہے تمہاری اور رات بھی زیادہ ہو  
 گئی ہے۔“

”کوئی بات نہیں آنٹی! آپ فکر نہ کریں  
 گاڑی صبح ڈرائیور لے جائے گا۔ میری وجہ سے  
 آپ لوگ ڈسٹرب ہوں مجھے یہ مناسب نہیں لگتا  
 خدا حافظ۔“ وہ انہیں کچھ بھی کہنے کا موقع دیے  
 بغیر آگے بڑھ گیا تو وہ اس کی ناراضگی کا سبب  
 جانے بغیر اسے جاتا دیکھتیں رہیں اور دل ہی دل  
 میں اسے خدا کے حفظ و امان میں دیتی کمرے میں  
 آ گئیں۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی اس طرح کہنے  
 کی۔“ وہ اس کا قصور نا سمجھتے ہوئے بھی اس پر پل  
 پڑیں۔

”اماں میں نے تو سرسری بات کی تھی ان کی  
 تکلیف کے خیال سے ہی منع کیا تھا نجانے کون  
 سی بات بھری لگ گئی انہیں۔“ اس نے وضاحت  
 کی۔

”اچھا اچھا اب زیادہ صفائیاں پیش کرنے  
 کی ضرورت نہیں ہے آرام سے سو جا۔“ وہ کچھ

اس سے اور...  
 اور پھر تین  
 چار میں جھلنے کے  
 تھی۔ ”دسہاں رہ  
 دس طبعہ

ہی۔ ”ٹھیک تو  
 اس کا جائزہ لیا۔  
 ”میرا خیال  
 دن اور ریٹ کر  
 ”نہیں میں  
 کر چکی ہوں۔“  
 ”کیا مطا  
 کیشن تو آئی تھی  
 ”آں...“

بولی۔  
 ”شاید یہ  
 گیا ہے۔“ وہ  
 ”سر نہیں  
 ”نہیں“

کو انگینڈ  
 کے بعد ہی آ  
 ”اچھا۔“  
 مارا دن کے  
 پکرانے لگا تھا  
 تو وہ جلد ہی چھ  
 کڑی گاڑی  
 اور جب وہ ار  
 تھکتے دیکھ کر پر  
 ”ارے  
 ”کیا



اس سے اور کچھ خود سے الجھتی کپ اٹھانے لگیں۔

اور پھر تین دن کے شدید زوالہ زکام اور  
پنچار میں جھلنے کے بعد وہ چوتھے دن آفس آئی  
تھی۔

”کہاں رہ گئیں تھیں بھی تم۔“

”بس طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“ وہ پھیکا سا  
ہنسی۔

”ٹھیک تو اب بھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے  
اس کا جائزہ لیا۔

”میرا خیال ہے کہ تم مزید چھٹی لے کر کچھ  
دن اور ریست کرو۔“

”نہیں میڈم! پہلے ہی بناتائے اتنی چھٹیاں  
کر چکی ہوں۔“

”کیا مطلب بناتائے تین دن کی لیو اپیلی  
کیشن تو آئی تھی تمہاری۔“

”آں..... اچھا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئی  
بولی۔

”شاید بیماری کا اثر میرے دماغ پر بھی ہو  
گیا ہے۔“ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

”سرنہیں آئے کیا؟“

”نہیں، آج صبح کی فلائیٹ سے ان کی مدر  
کو انگلینڈ سے آنا تھا، اب تو شاید وہ سچ بریک  
کے بعد ہی آئیں۔“

”اچھا۔“ کہہ کر وہ اپنے کام میں لگ گئی  
سارا دن کے کمر توڑ کام کے بعد اس کا سر  
چکرانے لگا تھا اور زکام کی شدت میں اضافہ ہو گیا  
تو وہ جلد ہی چھٹی لے کر گھر آ گئی۔ دروازے پر  
کھڑی گاڑی خالہ جان کی اطلاع دے رہی تھی  
اور جب وہ ان سے ملی تو ابھی بھی اسے مسلسل  
چھینکتے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

”ارے بیٹا! تمہاری طبیعت اتنی خراب تھی  
تو کیوں گئیں آفس، چلو ابھی میرے ساتھ میں

تمہیں خود ڈاکٹر سے چیک کرواں گی۔“  
”نہیں خالہ جان! میری میڈیسن رکھی ہیں  
وہی لے رہی ہوں۔“

”اسی لئے ٹھیک ہو گئی ہو۔“ انہوں نے  
مسکرا کر طنز کیا تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”نہیں یہ تو پھر آج کی ٹھکن کی وجہ سے۔“  
”کوئی بہانہ نہیں چلے گا چلو میرے ساتھ۔“

انہوں نے اسے پکڑ کر اٹھایا تو وہ بھی ان کی محبت  
کے سامنے مجبور ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اسے مکمل ریست  
بتائی تھی۔

اور جب اس نے پورے ہفتے بعد اس کے  
آفس میں قدم رکھا تو وہ لمحے بھر کے لئے چونکا  
تھا۔ اپنے مخصوص انداز میں نظریں جھکائے وہ  
آہستہ آہستہ چلی ٹیبل کے قریب آن رکی۔

”السلام و علیکم سر!“ وہ جو اس پر نظریں  
جمائے ہوئے تھا اس کے سلام کرتے ہی بے نیاز  
سار ہو کر اپنی مصروفیت ظاہر کرنے لگا۔

”سر! فائل چیک کر لیں۔“ اس نے  
فائلیں اس کے سامنے رکھیں۔

”ٹھیک ہے رکھ دیجئے میں کر لوں گا  
چیک۔“ اس کا پھولا پھولا سامنہ دیکھ کر اس کا جی  
چاہا کہ وہ اس سے اس کی ناراضگی کا سبب پوچھے  
لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینک  
گئی جسے ہونٹوں میں دبا کر نکل گئی۔ اس نے اس  
کے جاتے ہی پن پٹھا ایک دوسرے میں انگلیاں  
پھنسا کر چٹخا میں اور جڑے ہاتھوں کو بالوں میں  
پھیرا۔

مہینہ ختم ہو چکا تھا نجانے اسے کیا سوچھی کہ  
اس نے ڈرائیور کو پیسے دے کر ایک گھر کے  
پورے مہینے کا راشن منگوا اور ریمیل کی غیر  
موجودگی میں ہی اس کے گھر بھجوا دیا۔ شام کو گھر  
پہنچی تو اس کی اس کارکردگی پر آگ بگولہ ہو گئی۔

”اماں میں پوچھتی ہوں کہ آخر آپ نے یہ



سب کچھ رکھا کیوں؟“  
”اب ڈرائیور لے کر آیا تھا تو میں اسے کیا کہتی۔“ اماں کی بات پر وہ سچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”بھکاری سمجھ رکھا ہے ہمیں جو اٹھا کر اتنا کچھ بھیج دیا۔ یہ تو ہم دو لوگوں کے لئے چھ مہینے کا راشن ہے۔ یہ بیف مٹن چکن مچھلی، یہ سب ایک عدد فرنیج بھی جھجھکا دیتے ساتھ ہی۔“ اس نے طنز کیا۔

”اور یہ اتنی ساری دالیں جیسے پوری بارات کو حلیم بنا کر کھلانا ہے ہم نے اور یہ سرف، صابن، شیمپو آخر کیا ضرورت تھی انہیں یہ سب کچھ کرنے کی۔“ وہ تمللا رہی تھی۔

”اتنے ہی گرے پڑے سمجھ لیا ہے ہمیں۔“  
”اچھا بس زیادہ بیک بک نہ کر تجھے تو کسی کے خلوص کی پہچان ہی نہیں ہے۔ اب اگر اس نے ہمارا اتنا خیال کیا اتنی محبت کرتا ہے وہ مجھ سے تو کیا میں منہ توڑ کر کہہ دیتی کہ لے جاؤ واپس ہمیں نہیں چاہیے یہ سب، اتنے عرصے بعد مجھے میرے اپنے ملے ہیں اور تجھے برداشت نہیں ہو رہا۔“

”سال بھر ہو گیا ہے آپ کے اپنوں کو ملے ہوئے پہلے تو خیال نہیں آیا۔ آپ نے اپنی مجبوریوں کا رونا رویا ان کے سامنے تو ہی احساس ہوا ناں۔“

”چل ہو تو گیا۔ تیرے باپ کو تو وہ بھی نہ ہوا کبھی۔ آج اگر وہ کسی قابل ہوتا تو کیوں دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتے ہم اور کیوں تجھے یوں صبح شام دھکے کھانا پڑتے۔“ وہ رو دیں تو وہ لب بھیج کر خاموش ہو گئی۔ وہ ان کے قریب جا کر انہیں چپ کر دانا چاہتی تھی۔ تسلی دینا چاہتی تھی لیکن پھر اٹھ کر مٹھیاں پیچتی کرسی کو ٹانگ مار کر

اندر چلی گئی۔  
اگلا دن چھٹی کا تھا۔ اماں نے کچھ گوشت صاف کر کے ہمسائیوں کی فرنیج میں رکھوا دیا اور کچھ مزیدار کھانے بنا کر راحیلہ اور اس کے سرال والوں کی شاندار سی دعوت کر ڈالی اور جاتے جاتے ڈھیر سارا کھانا ہمراہ بھی کر دیا۔

صبح وہ آفس پہنچی تو سیدھی اس کے کمرے میں گئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کے تیور بھانپ گیا تھا، لیکن جب وہ بولی تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

”تھینک یو ویری مچ سر! آپ نے ہم بے سہارا لوگوں کا اتنا خیال کیا۔“ وہ توقع کے برعکس بہت نرم لہجے میں بات کر رہی تھی۔

”لیکن ہم جیسے غریب لوگوں کے کندھے بہت ناتواں ہوتے ہیں سر! کسی کے احسانوں کا بوجھ زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتے۔“  
اس نے بیک میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے تین نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

”پلیز آئندہ ایسی رحمت مت کیجئے گا۔“  
آخری جملے تک آتے آتے اس کا لہجہ اچھا خاصا کھر درا اور دو ٹوک ہو گیا تھا۔

توہین کے شدید احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اعصاب تن گئے اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا وہ پلٹی اسی دم دروازہ کھلا اور رضیہ جنید اندر آ گئی تو وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی وہ دانتوں پر دانت جمائے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

”ہائے زومی ڈیر، ہاؤ آر یو۔“ اس کے پر جوش انداز پر بھی وہ خاموش رہا وہ تیزی سے اپنے اعصاب کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہائے زومی مائی ڈارلنگ، یو آر گریٹ۔“  
”اس کو اردو میں کیا کہتے ہیں۔“



”ہاں اس کو کہتے ہیں، دل کو دل سے راہ ہوتا۔“ اس نے خالص مغربی زبان میں اردو محاورہ بڑے اسٹائل سے ادا کیا۔  
”پائے داوے تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔“ اس نے پیسے اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

”یہ پیسے وہی رکھ دو۔“ اس کے برہم سا کہنے پر وہ ناجی سے دیکھنے لگی۔  
”کیوں؟“ اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”میں نے کہا ناں یہ وہی رکھ دو۔“ اس نے ”یہ“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس نے کندھے اچکائے اور پیسے واپس رکھ دیئے۔  
”بولو کتنے پیسے چاہئیں تمہیں۔“ اس نے اپنا والٹ نکالا۔

”اونٹنی تھرٹین تھاوزنٹ، اچھوٹکی پاپا کا ڈرافٹ نہیں آیا ابھی تک جیسے ہی ڈرافٹ آیا تمہیں واپس کر دوں گی۔“

”ویسے تمہارے اور میرے پیسے سپرٹ تو نہیں ہیں۔“ اس نے بڑے دلربا انداز میں کہا اور نجانے کیوں آج پہلی بار اسے اس کا یہ انداز انتہائی ناگوار محسوس ہوا تھا۔

”بائی داوے ان میں ایسی کیا بات ہے جو میں یہ نہیں لے سکتی۔“ اس نے اس کے ہاتھ سے پیسے لیتے ہوئے ٹیبل پر رکھے پیسوں کی طرف اشارہ کیا۔

”تم اپنے کام سے کام رکھو اور میں نے تمہیں ہزار بار قلع کیا ہے کہ میرے آفس مت آیا کرو، تم اپنا مطالبہ ماما سے بھی کہہ سکتی تھیں۔“

”کچھ زیادہ ہی روڈ نہیں ہو رہے تم اس وقت اور میری یہ بات کان کھول کر سن لو تم، میرے فیائی تم ہو ماما نہیں تم سے پیسے لینے کا میں پورا حق رکھتی ہوں انڈسٹینڈ۔“ اس کے دلبرانہ انداز اب اس کی برداشت سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔

”نہک اس وقت تم جاؤ اور وقت بے وقت رہے تھے۔“  
”مجھے ڈسٹرب کرنے مت آیا کرو۔“

”اوکے ڈارلنگ بائے۔“ وہ اس کے گال کو چھوتے ہوئے بولی اور واپس چلی گئی۔ اس کی پرسوج نگاہوں نے اس کا دروازے تک پیچھا کیا تھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔  
”ایک وہ لڑکی ہے اور ایک یہ۔ واؤ میرے مولا اتنا ڈفرینس ایک ہی صنف میں۔“

وہ اس وقت آفس میں موجود اپنے کام میں منہمک تھا جب اس کے موبائل کی بپ ہوئی۔  
”جی ماما السلام وعلیکم!“

”علیکم السلام احزم! تم فوراً گھر آ جاؤ بیٹا!“ ان کی گھبرائی ہوئی آواز اس تک پہنچی تو۔  
”خیریت ماما!“

”لندن سے میجر صاحب کا فون آیا ہے کہ تمہارے پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ہسپتال میں ہیں وہ۔“

”اومائی گاڈ! کیا ہوا ہے انہیں؟“  
”مجھے نہیں معلوم تم ایسا کرو پہلی فلائیٹ سے میری سیٹ کنفرم کر واؤ۔“

”اوکے ماما میں ابھی آ رہا ہوں آپ گھبرا ئیں مت۔“

”وہاں پہنچتے ہی مجھے فون کر دیجیے گا ماما!“  
وہ اس وقت ایئر پورٹ کے اندر داخل ہو رہے تھے۔

”اوکے بیٹا!“ انہوں نے اس کی پیشانی چومی اور اندر چلی گئیں۔

وہ وقفے وقفے سے پاپا کے نمبر پر فون کر رہا تھا لیکن وہ مسلسل بند تھا۔ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ ساری رات جاگنے کے بعد ابھی ابھی سویا تھا کہ فون کی بیل بج اٹھی۔



”اما! اتنی دیر سے فون کیا ہے آپ نے  
آپ کو معلوم ہے کہ میں کتنا پریشان ہوں۔  
”بیٹا! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے  
جہاں سے بابا بالکل ٹھیک ہیں ان کا بی بی اب ہو  
گیا تھا اور وہ چیک اپ کے لئے ہسپتال گئے  
تھے۔ منجر صاحب نے سرسری سا ہی ذکر کیا تو میں  
گھبرا گئی۔ تم کوئی ٹینشن مت لینا مانی چائے وہ  
بالکل ٹھیک ہیں اور میں اب کچھ دن رکوں گی  
یہاں۔“

”پاپا سے بات کروائیں میری۔“ اور پھر وہ  
پاپا سے بات کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔

اما کو گئے ابھی دو ہی دن ہوئے تھے لیکن  
اسے ایسا لگتا کہ جیسے نجانے کتنے دن گزر گئے ہو  
آفس سے آنے کے بعد وہ پوری نیند لے کر اٹھا  
تھا شام کا ملگج سا اندھیرا پھیل چکا تھا گھر کا کل  
وقت ملازم کل ہی چھٹی لے کر اپنے گاؤں گیا ہوا  
تھا۔ پاپا کی غیر موجودگی ڈرائیور کی ویسے ہی چھٹی  
ہوتی تھی گیٹ پر موجود چوکیدار سینما کا شوقین بھی  
رات کے شو دیکھنے کے لئے اس کی بڑی خوشامد  
کر کے چھٹی لے گیا۔ گھر کی صفائی ستھرائی کے  
لئے ملازمہ صبح اس کے آفس جانے کے بعد آتی  
تھی۔ اس نے خود ہی اپنے لئے چائے بنائی اور  
اسٹڈی میں چلا آیا اور ابھی اسے اپنے کام میں  
مصرف ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک درد  
ناک پکار سن کر چونک اٹھا۔

”سلسلی آیا، سلسلی آیا، کہاں ہو تم باہر آؤ، دیکھ  
تیری نصیبوں جلی بہن تیرے در پر بھیک مانگنے آئی  
ہے۔“

”آئی! وہ گھر کر اٹھا اور بھاگتا ہوا باہر آیا  
کہ ان کی دل کو چیرتی ہوئی پکار مسلسل جاری تھی۔  
وہ آنکھیں بند کیئے روئے چلی جا رہی تھیں۔ کم صم  
کی ریل عام سے حلے میں سیاہ چادر کی بجائے  
گھر کا معمولی سا دوپٹہ لئے ایک طرف کھڑی

تھی۔

”کیا ہوا آنٹی!“ اس نے انہیں بازوؤں  
میں پکڑ کر بچھوڑ ڈالا۔

”میری بچی، ہائے میری بچی کو بچا لو ہائے  
میری ریل کو بچا لو۔“ وہ بین کرنے کے انداز  
میں فریاد کرنے لگیں اس نے ایک پریشان نظر خود  
سے بے خبر ریل کو دیکھا۔

”آئی! پلیز بتائیں تو سہی ہوا کیا ہے  
آخر؟“

”آپا، آپ کہاں ہیں میری انہوں نے کہا تھا  
کہ وہ میری ہر مشکل میں کام آئیں گی وہ میری  
مدد ضرور کریں گی۔ ہائے آبا مدد کی ضرورت پڑ گئی  
ہے مجھے اب تو کہاں چھپی چھپی ہے۔ ہائے میری  
بچی برباد ہو جائے گی، آبا اس کو بچالے، ہائے  
میں کیا کروں کیسے کہوں؟“

”آئی! پلیز ایسے مت کریں مجھے بتائیں  
کیا ہوا ہے۔“ اس کا دل کسی انہونی کے خیال  
سے لرز رہا تھا۔

اما گھر پر نہیں ہیں وہ انگلینڈ گئیں ہیں پاپا  
کے پاس آپ یہاں آئیں بیٹھیں اور مجھے بتائیں  
کیا بات ہے میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ جو  
بھی مجھ سے ہو سکا میں کروں گا۔“ اس نے انہیں  
پکڑ کر صوفے پر بیٹھایا اور ساتھ ہی اپنی مدد کا  
یقین دلاتے ہوئے پانی کا گلاس بھر کر ان کی  
طرف بڑھایا۔ لیکن ان کے ذہن میں جیسے بجلی  
سے کوندی تھی۔

”ہاں، ہاں تم ہی میری مدد کر سکتے ہو، تم  
میری بیٹی سے شادی کر لو۔“ وہ اچانک ہی اٹھ کر  
بویس تو اس کے ساتھ ساتھ ریل کو بھی جھٹکا لگا  
تھا۔

(باقی اگلے ماہ)

☆☆☆

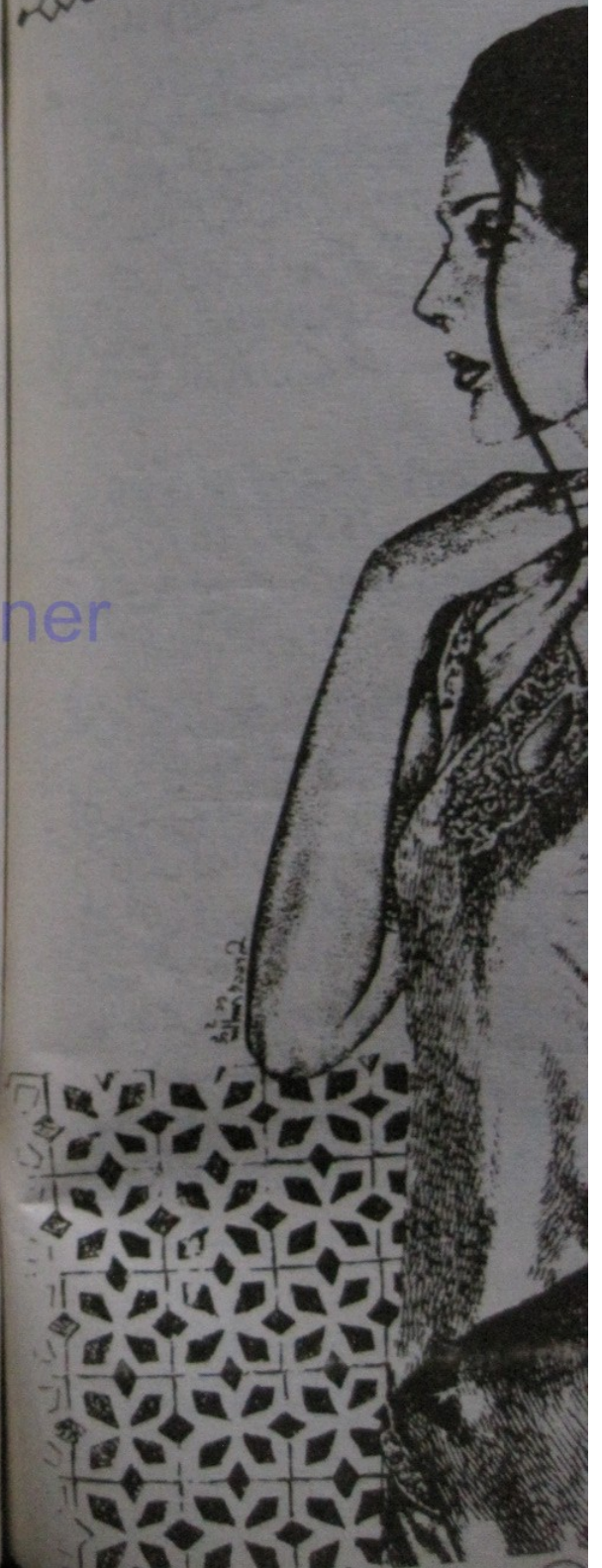


دوسری قسط

کمال ناول

مجھے اپنے ملنے کا غرور دو

شاہ ظفر



Skorpio  
FriendsKorner



”کیا؟“

”ہاں، تم ریمیل سے نکاح کر لو ہاں اس کا یہی حل ہے ورنہ، ورنہ اس کا باپ اسے اس بوڑھے سیٹھ سے بیاہ دے گا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی آپ؟“

”جھک کہہ رہی ہوں، نکاح پر نکاح نہیں ہوتا۔ بس کچھ دنوں کے لئے اس کو اپنا نام دے دو اور کچھ نہیں چاہیے ہمیں تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“ اماں بول رہیں تھیں اور وہ حیران پریشان انہیں دیکھ رہا تھا جب کہ ریمیل ہسٹریائی انداز میں لٹی میں سر ہلاتے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”لیکن آنٹی! یہ سب کیسے ہو سکتا ہے اور پھر اتنی جلدی۔“

”ماما بھی یہاں نہیں ہیں۔“ اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”خدا کے لئے تمہیں اللہ کا واسطہ انکار مت کرنا، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں میری بچی کی زندگی بجاو، ایک غریب بے سہارا عورت تم سے مدد کی جھیک مانتی ہے۔“

”آنٹی پلیز آپ اس طرح تو.....“ وہ ابھی بول ہی نہ پایا تھا کہ انہوں نے اپنی چادر اتار کر اس کے قدموں میں رکھ دی۔

”جھے میری اس عزت اس چادر کا واسطہ انکار نہ کرنا۔“ وہ اسی صورتحال کے لئے قطعی تیار نہیں تھا۔

”یہ کیا کر رہی ہیں آنٹی آپ۔“ وہ خود بھی جھکی اس کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔

”اماں!“ وہ چیخ کر آگے بڑھی تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہو تم، اٹھو گھر چلیں۔“ وہ انہیں کھینچ کر اٹھانے لگی۔ اس کے قدموں میں

چڑی ماں کی چادر اور اس کے قدموں پر جھکی اس کی ماں اسے حواسوں میں لے آئی تھی۔

ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو ابا آیا تھا وہ دونوں

ابھی مغرب کی نماز ادا کر رہیں تھیں کہ دروازہ پر دستک ہوئی تھی اماں نے سلام پھیرا اور دروازہ کھولنے چلی گئیں۔

”کون؟“ انہوں نے پوچھنے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔

”تو۔“

”ہاں میں، کیوں تجھے خوشی نہیں ہوئی۔“ عورت ہے تو اتنا عرصہ شوہر جیل میں رہا تو پوچھا تک نہیں اور اب آگیا ہوں تو حیران ہے۔

”خوشخبری لایا ہوں تیرے لئے۔“ میں بھی چارپائی پر پورے استحقاق سے بولا۔

”خوشخبری اور تو تیرے پاس سوائے منحوس خبر کے کوئی دوسری بات نہیں انہوں نے حقارت سے کہا۔

”اری ناشکری عورت ایسا بھی کیا نہیں ہوں میں بہت بڑی خوشخبری لایا ہوں بٹی کدھر ہے ارے کیا بھلا سا نام ہے اس کا ارے لعنت ہے مجھ پر اپنی بیٹی کا نام بھی نہیں ارے وہ چھوٹی والی بڑی کو تو، تو نے بیاہ دیا اب چھوٹی کی ہی باری ہے۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔

”کیوں کیا کام ہے تجھے اس سے، پیسے چاہئے تو ایک پیسہ نہیں تیرے لئے ہمارے پاس انہوں نے اس کے لفظوں پر غور کئے بغیر کہا۔

”ناں راشدہ بیگم ناں، اب مجھے پیسے کی کوئی تھوڑ نہیں، پتہ ہے سیٹھ زمان خان نے مجھ سے میری بیٹی کا رشتہ مانگا ہے۔“ اس نے اکثر کہا۔

”کیا، کیا بکواس کر رہا ہے تو۔“

”بکواس نہیں کر رہا چ کہہ رہا ہوں میرا جان! بڑا بنا پھرتا ہے۔ میری ذمہ داری لینے کو ابھی نہیں تھا پھر پتہ نہیں کہاں دیکھ لیا اسے کہ دیوانہ ہی ہو گیا۔ نہ صرف مجھے چھڑوایا بلکہ کاروبار

پچھلے دنوں میں چھپ چکے ہیں اگر میری ساری زندگی ساری زندگی کا بوڑھا ساری زندگی کے لئے گا، ساری زندگی کے لئے گا، ساری زندگی کے لئے گا۔

”تو۔“

”ہاں میں، کیوں تجھے خوشی نہیں ہوئی۔“ عورت ہے تو اتنا عرصہ شوہر جیل میں رہا تو پوچھا تک نہیں اور اب آگیا ہوں تو حیران ہے۔

”خوشخبری لایا ہوں تیرے لئے۔“ میں بھی چارپائی پر پورے استحقاق سے بولا۔

”خوشخبری اور تو تیرے پاس سوائے منحوس خبر کے کوئی دوسری بات نہیں انہوں نے حقارت سے کہا۔

”اری ناشکری عورت ایسا بھی کیا نہیں ہوں میں بہت بڑی خوشخبری لایا ہوں بٹی کدھر ہے ارے کیا بھلا سا نام ہے اس کا ارے لعنت ہے مجھ پر اپنی بیٹی کا نام بھی نہیں ارے وہ چھوٹی والی بڑی کو تو، تو نے بیاہ دیا اب چھوٹی کی ہی باری ہے۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔

”کیوں کیا کام ہے تجھے اس سے، پیسے چاہئے تو ایک پیسہ نہیں تیرے لئے ہمارے پاس انہوں نے اس کے لفظوں پر غور کئے بغیر کہا۔

”ناں راشدہ بیگم ناں، اب مجھے پیسے کی کوئی تھوڑ نہیں، پتہ ہے سیٹھ زمان خان نے مجھ سے میری بیٹی کا رشتہ مانگا ہے۔“ اس نے اکثر کہا۔

”کیا، کیا بکواس کر رہا ہے تو۔“

”بکواس نہیں کر رہا چ کہہ رہا ہوں میرا جان! بڑا بنا پھرتا ہے۔ میری ذمہ داری لینے کو ابھی نہیں تھا پھر پتہ نہیں کہاں دیکھ لیا اسے کہ دیوانہ ہی ہو گیا۔ نہ صرف مجھے چھڑوایا بلکہ کاروبار

پچھلے دنوں میں چھپ چکے ہیں اگر میری ساری زندگی ساری زندگی کا بوڑھا ساری زندگی کے لئے گا، ساری زندگی کے لئے گا، ساری زندگی کے لئے گا۔

”تو۔“

”ہاں میں، کیوں تجھے خوشی نہیں ہوئی۔“ عورت ہے تو اتنا عرصہ شوہر جیل میں رہا تو پوچھا تک نہیں اور اب آگیا ہوں تو حیران ہے۔

”خوشخبری لایا ہوں تیرے لئے۔“ میں بھی چارپائی پر پورے استحقاق سے بولا۔

”خوشخبری اور تو تیرے پاس سوائے منحوس خبر کے کوئی دوسری بات نہیں انہوں نے حقارت سے کہا۔

”اری ناشکری عورت ایسا بھی کیا نہیں ہوں میں بہت بڑی خوشخبری لایا ہوں بٹی کدھر ہے ارے کیا بھلا سا نام ہے اس کا ارے لعنت ہے مجھ پر اپنی بیٹی کا نام بھی نہیں ارے وہ چھوٹی والی بڑی کو تو، تو نے بیاہ دیا اب چھوٹی کی ہی باری ہے۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔



”چپ کر جا میں کہتی ہوں چپ کر جا ورنہ  
تیری زبان کاٹ کر پھینک دوں گی اگر میری  
سے متعلق ایک بات بھی ایسی کہی۔“ وہ ریمیل  
کے لئے ایسی ہی جذباتی تھیں۔

”ارے پاگل ہونی ہے تو، ساری زندگی کی  
بیاں لگ جائیں گی اور وہ ستر اسی سال کا بوڑھا  
بیٹو اور کتنا عرصہ جی لے گا، ساری زندگی راج  
تو حیران ہو کرے گی راج۔“

”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے  
لئے۔“ وہ غیرت بے حیا۔ ”انہوں نے اسے دونوں ہاتھوں  
ن سے لیتے دھکا دیا۔

”ارے پاگل مت بن راشدہ خود سوچ کہ  
بٹھے بٹھائے لائٹری نکل آئی ہے ہماری۔“

”چلا جا یہاں سے اس سے پہلے کہ میرے  
ہاتھوں سے قتل ہو جائے تو چلا جا یہاں سے۔“

انہوں نے اسے پورے زور سے دھکا دیا اس  
لحے ان کے کمزور و نیا تو اس جسم میں نجانے کہاں  
سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے  
جا لگا اپنی اولاد کو بچانے کے لئے تو چڑیا بھی  
بیانپ سے لڑ جاتی ہے اور پھر وہ تو ایک انسان  
تھیں اور ان کے سامنے نشے کا مارا ہوا بوڑھا  
کمزور بے غیرت باپ کھڑا تھا وہ کیوں نہ شیر کی  
طرح جھپٹتی۔

”تو، تو پاگل ہو گئی ہے راشدہ مگر سن چاہے  
مرضی دھکے دے پرسوں شام کو بارات لے کر  
آؤں گا میں اور رانی بنا کر لے جاؤں گا اپنی بیٹی کو  
اور سن اگر کوئی گڑبڑ کی تو یاد رکھنا بڑے خطرناک  
لوگ ہیں وہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے  
مجھے بھی جا کر سیٹھ کی طرف سے تیاریاں کرنی  
ہیں۔ یہ لے کچھ پیسے رکھ لے یہ دو دن بھی اس  
لئے رکھے ہیں کہ تو اچھی سی تیاری کر لے اور  
خوبصورت سی دلہن بنانا میری بیٹی کو بڑی شان  
سے بارات آئے گی اس کی۔“

”میں تھوکتی بھی نہیں تیرے لئے کچھ دلچسپ  
یہاں سے اور اپنی منحوس اہل لے کر یہاں نہ  
آنا۔“ وہ چینی اور اس کے نکلتے ہی نور ادراس ہند  
کر لیا اور اسی سے ٹیک لگا کر یقینی چلیں گئیں۔  
برآمدے میں کھڑی ریمیل چارپائی پر بیٹھ گئیں۔  
دونوں کے وجود کی عمارتیں زلزلوں کی زد میں تھیں  
اور اس سے پہلے کہ یہ عمارتیں ڈھے کر آرزوؤں  
کے بلے تلے دب جائیں۔ وہ جھٹکے سے انھیں  
بھلا گ کر ریمیل کے پاس آئیں اس کا ہاتھ تھاما  
اور چپتی ہوئی گھر سے باہر لے آئیں۔ رات کی  
تاریکی ہر چیز کو آہستہ آہستہ اپنی لپیٹ میں لے  
رہی تھی اور یہ تاریکی شاید اس کے وجود میں بھی  
سرائیت کر گئی تھی اس لئے تو اسے کچھ بھی سمجھانی  
نہ دے رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کب اماں نے  
رکشہ رکوا یا کب وہ اس میں سوار ہوئیں کیسے یہاں  
ٹیک پہنچی اماں کیا کہہ رہی تھیں وہ کچھ نہیں جانتی  
تھی۔ لیکن اس کے قدموں میں پڑی اماں کی  
چادر اور اس کے قدموں میں جھلی اس کی ماں  
اسے حواسوں میں لے آئی تھی۔

”اماں!“ وہ چیخ کر آگے بڑھی تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہو تم۔“

”اٹھو، اٹھو یہاں سے چلو گھر، کچھ نہیں ہوگا  
مجھے۔“ وہ انہیں بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔

”معاف کیجیے گا سر! میری ماں پاگل ہو گئی  
ہے اسے بیٹی کی محبت نے پاگل کر دیا ہے۔“ وہ

منکسل روتے ہوئے اسے دیکھ کر بولی اور پھر  
انہیں اٹھانے لگی۔

”انھیں اماں چلیں گھر چلتے ہیں ابھی ایسا  
بھی اندھیر نہیں مچا کہ وہ جو مرضی کرتا پھرے۔“

”چھوڑ دے مجھے تو نہیں جانتی اپنے باپ کو  
تجھے نہیں پتہ کیسے درندوں میں پھنسا ہے وہ، وہ

لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”بیٹا! میں تم سے کچھ نہیں چاہتی صرف  
اسے اپنا نام دے دو یہ محفوظ ہو جائے گی۔ نکاح پر



”میں تھوکتی بھی نہیں تیرے میسے دفع ہو جا  
یہاں سے اور اپنی منحوس شکل لے کر یہاں نہ  
آنا۔“ وہ چچی اور اس کے نکلتے ہی فوراً دروازہ بند  
کر لیا اور اسی سے قیک لگا کر بیٹھتی چلیں گئیں۔  
برآمدے میں کھڑی ریمیل چارپائی پر بیٹھ گئی۔  
دونوں کے وجود کی عمارتیں زلزلوں کی زد میں تھیں  
اور اس سے پہلے کہ یہ عمارتیں ڈھسے کر آرزوؤں  
کے ملے تلے دب جائیں۔ وہ جھٹکے سے انھیں  
بھلا گ کر ریمیل کے پاس آئیں اس کا ہاتھ تھما  
اور کھینچتی ہوئی گھر سے باہر لے آئیں۔ رات کی  
تاریکی ہر چیز کو آہستہ آہستہ اپنی لپیٹ میں لے  
رہی تھی اور یہ تاریکی شاید اس کے وجود میں بھی  
سرائیت کر گئی تھی اس لئے تو اسے کچھ بھی سمجھائی  
نہ دے رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کب اماں نے  
رکشہ رکھوایا کب وہ اس میں سوار ہوئیں کیسے یہاں  
تیک پہنچی اماں کیا کہہ رہی تھیں وہ کچھ نہیں جانتی  
تھی۔ لیکن اس کے قدموں میں پڑی اماں کی  
چادر اور اس کے قدموں میں جھلی اس کی ماں  
اسے حواسوں میں لے آئی تھی۔  
”اماں!“ وہ چیخ کر آگے بڑھی تھی۔  
”یہ کیا کر رہی ہو تم۔“  
”اٹھو، اٹھو یہاں سے چلو گھر، کچھ نہیں ہوگا  
مجھے۔“ وہ انہیں بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔  
”معاف کیجیے گا سر! میری ماں پاگل ہو گئی  
اسے اسے بیٹی کی محبت نے پاگل کر دیا ہے۔“ وہ  
منکسل روتے ہوئے اسے دیکھ کر بولی اور پھر  
انہیں اٹھانے لگی۔

”انھیں اماں چلیں گھر چلتے ہیں ابھی ایسا  
بھی اندھیر نہیں مچا کہ وہ جو مرضی کرتا پھرے۔“  
”چھوڑ دے مجھے تو نہیں جانتی اپنے باپ کو  
تجھے نہیں پتہ کیسے درندوں میں پھنسا ہے وہ، وہ  
لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“  
”بیٹا! میں تم سے کچھ نہیں چاہتی صرف  
اسے اپنا نام دے دو یہ محفوظ ہو جائے گی۔ نکاح پر

”چپ کر جائیں کہتی ہوں چپ کر جا ورنہ  
تیری زبان کاٹ کر پھینک دوں گی اگر میری  
جس تیری کے متعلق ایک بات بھی ایسی کہی۔“ وہ ریمیل  
لے ایسی ہی جذباتی تھیں۔  
”ارے پاگل ہوئی ہے تو، ساری زندگی کی  
”ارے پاگل ہوئی ہے تو، ساری زندگی کی  
”ارے پاگل ہوئی ہے تو، ساری زندگی کی

”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے  
”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے  
”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے

”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے  
”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے  
”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے

”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے  
”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے  
”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے

”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے  
”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے  
”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے

”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے  
”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے  
”میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے بے



نکاح نہیں ہو سکتا پھر وہ کچھ نہیں کر سکیں۔ جب یہ بلا سر سے مل گئی طلاق دے دینا تم، تم فیصلہ کرنے میں باختیار ہو۔“

”اماں خدا کے لئے چپ کر جاؤ اور چلو گھر چلیں۔“ اس کی بات پر اس نے بہت سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا جس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے اور بے بسی چہرے سے مترشح تھی۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں جادر اٹھائی اماں کے سر پر بھی انہیں بازوؤں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور خود وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں رکھے کیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ ریسور ہاتھ میں تھا چند منٹ بات کی اور پھر اسے کریڈل پر رکھ کر باہر نکل گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو جو لوگ اس کے ساتھ تھے وہ انہیں دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ منہ پر ہاتھ رکھے آنکھیں پھاڑے وہ حیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اماں نے اس کا ڈوپٹہ سر کے سر جھکا دیا۔ وہ انہیں لئے صوفوں کی طرف بڑھ گیا۔ نجانے کون کون سے کاغذات تھے جنہیں وہ پر کر رہا تھا اور پھر وہ لوگ اٹھ کر اس کی جانب آئے۔ جب کہ وہ وہیں بیٹھا رہا اسے اپنی سانسیں بند ہوئی محسوس ہو رہی تھیں وہ آنکھوں میں بے یقینی لئے انہیں دیکھ رہی تھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ان سب کو دھکیلتی ہوئی یہاں سے کہیں دور بھاگ جائے۔

”لیکن کہاں۔“ کہیں بھی تو کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

”جی اجازت ہے۔“

”جی مولوی صاحب شروع کریں۔“ اور پھر نجانے وہ اس سے کیا پوچھ رہے تھے اس کی نگاہیں تو اماں پر جمی تھیں جن سے مسلسل آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی گود میں گر رہی تھیں۔

”بولو بیٹا! قبول ہے۔“ مولوی صاحب

تیسری بار پوچھ چکے تھے۔

”ہاں، بول دے میری بیٹی۔“ اماں نے فریاد کی لیکن ایک جامد خاموشی تھی جو کہ ٹوٹ نہ رہی تھی اور پھر اماں نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے اور وہ جس کی ساری توجہ ادھر ہی تھی یہ منظر دیکھ کر لب بھینچ گیا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ کسی بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ مولوی صاحب نے اپنے الفاظ دوبارہ دہرائے۔

”قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔“ کہتی تھی وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی آواز کانوں تک پہنچتی ہی ایک طویل سانس اس کے ہونٹوں سے خارج ہوئی۔

ان سب کے جانے کے بعد وہ صوفے کے بازو پر کھنی بجائے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھے بیٹھا۔ اس وقت وہ اپنے احساسات سے خود کو بے خبر تھا۔ خود کو بھی سمجھنے سے قاصر تھا وہ۔

”اچھا بیٹا! اب ہمیں بھی اجازت دو، تم جو کچھ ہمارے لئے کیا اس کے احسان مند ہیں لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ جیسے حالات سازگار ہوئے تم اپنا فیصلہ کرنے میں سہارا بنو گی۔“

”اختیار رہو گے۔ جس خاموشی سے یہ سب ہوئے ہے اسی راز داری سے ختم ہو جائے گا میں کوئی شکر کروں گی کہ اب جلد از جلد ہمارے جوڑ کار شہناز مل جائے تم پر بھی بھروسہ میں نے اسی لئے کیا ہے کہ تم اس شخص کے بیٹے ہو جس نے میری بے اعتباری کو بھی دھوکا نہیں دیا۔“ وہ ٹوٹے بھرے لہجے میں بولتی اماں کی طرف منہ اٹھائے دیکھ رہی تھی۔

”خدا حافظ بیٹا!“ وہ پٹی اور صوفے پر بیٹھا ریمیل کو اٹھایا تو اس نے بنا نظر اٹھائے اماں کے قدم سے قدم ملا دیئے۔ وہ انہیں جاتا ہوا دیکھتا اس کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے آج وہ اپنا



بول دے میری بیٹی۔ ایک جامد خاموشی کی جو کہ اس نے دونوں ہاتھوں کی ساری قوت لے کر لب پہنچ گیا۔ روستہ بندھ چکی تھیں۔ کسی بزرگ نے نہ رکھا۔ مولوی صاحب نے بولے۔

قبول ہے، قبول ہے۔ میں چہرہ چھپا کر پھوٹنے کی آواز کانوں تک پہنچنے کی آواز کے ہونٹوں سے خار بن جائے۔

جائے کے بعد وہ صوفے پر ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر اپنے احساسات سے فوج بھجنے سے قاصر تھا وہ۔

بہیں بھی اجازت دو، تمہیں کیا اس کے احسان مند بن دلائی ہوں کہ تم اپنا فیصلہ کرنے کی خاموشی سے یہ سب سے ختم ہو جائے گا میں راز جلد ہمارے جوڑ کا روستہ میں نے اسی بیٹے ہو جس نے میری دیا۔ وہ ٹوٹے کھڑے طرف منہ اٹھائے۔

وہ بیٹی اور صوفے نے بنا نظر اٹھائے۔ وہ انہیں جاتا ہوا دیکھا تھا جیسے آج وہ اپنا

بول دے میری بیٹی۔ ایک جامد خاموشی کی جو کہ اس نے دونوں ہاتھوں کی ساری قوت لے کر لب پہنچ گیا۔ روستہ بندھ چکی تھیں۔ کسی بزرگ نے نہ رکھا۔ مولوی صاحب نے بولے۔

قبول ہے، قبول ہے۔ میں چہرہ چھپا کر پھوٹنے کی آواز کانوں تک پہنچنے کی آواز کے ہونٹوں سے خار بن جائے۔

جائے کے بعد وہ صوفے پر ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر اپنے احساسات سے فوج بھجنے سے قاصر تھا وہ۔

کی، بس تو چھوڑ ان باتوں کو اور دفتر چلی جا اور کوشش کرنا دیر سے آنے کی میں بھی گھر پہنچتا ہوں ڈال کر کسی کے گھر بیٹھ رہو گی نہیں تو پھر ایسا کیوں نہ کریں کہ تو دفتر سے سیدھی خالہ کی طرف چلی جا میں بھی وہیں آ جاؤں گی۔

نہیں کہیں نہیں جاؤں گی اماں گھر آؤں گی سیدھی جو ہو گا ناں دیکھا جائے گا۔ اس نے سخت لہجے میں دو ٹوک جواب دیا اور اٹھ کر آفس جانے کی تیاری کرنے لگی۔

”مسز خان، مس زیدی پہنچ گئیں ہیں تو انہیں میرے کمرے میں بھیجیں۔“

”نہیں ابھی تو وہ نہیں آئی اور نہ ہی کوئی اطلاع دی ہے اس نے کل بھی بنا بتائے ہی چھٹی کر لی تھی۔“ وہ کچھ پریشانی سے بولیں۔

”ہوں۔“ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”شاید وہ اب نہ آئے۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

”کچھ کہا تم نے۔“

”ہاں، میں تو ٹھیک ہے آپ اپنا کام کریں۔“

”کیا بات ہے احزم میں نوٹ کر رہی ہوں تم کل سے کچھ ڈپر ہیں ہو، کوئی پر اہلم ہے کیا انگل ٹوٹ گیا ہیں ناں۔“

”ہاں ٹھیک ہیں وہ بس ان کی طبیعت کچھ خراب تھی اور وہ اتنی دور ہیں بس شاید اسی وجہ سے۔“ اس نے بات ٹالی تو وہ سر ہلا کر رہ گئیں اور اسے تسلی دیتی ہوئیں باہر نکل گئیں۔

ریمل جب آفس پہنچی تو وہ اپنے کمرے میں موجود نہیں تھا۔

”کیا بات ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ مسز خان منتظر تھیں۔

”جی میڈم! طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری۔“

وہ ایک بار اپنی سیٹ پر بیٹھی تو دوبارہ وہاں سے اٹھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ میڈم نے بھی اس کی

Skorpio  
Friends  
Korner







ہر اساتھ تھا۔  
 ”آیا تھا بڑی جلدی میں تھا کہنے لگا آج  
 کے لئے تیاری نہ کرنا ہارات ٹھوڑے دنوں بعد  
 آئے گی۔“ اتنا کہا اور میری سنے بغیر ہی چلا گیا۔  
 ”اور ہم تو جیسے ساری تیاری کیے بیٹھے  
 ہیں۔“

”اماں یہ گلی کے موڑ پر خالہ کا ڈرائیور ملا تھا  
 یہ لفافہ دے گیا ہے۔“

”کیا ہے اس میں؟“  
 ”پتہ نہیں میں نے تو کھول کر نہیں دیکھا۔“  
 اس نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا اور اندر بڑھ  
 گئی۔

انہوں نے اسے کھولا تو اسے دیکھتے ہی جیسے  
 اس سے چھپانے کے لئے چوری رازداری کے  
 انداز میں اپنے کمرے میں لگیں اور کس میں  
 رکھے کپڑوں کی سب سے چلی تہ میں اسے چھپایا  
 تھا۔ اب ان کے پاس ایک ثبوت تو موجود تھا  
 جس سے وہ اپنی بیٹی کی زندگی تباہ ہونے سے بچا  
 سکتی تھیں۔

دو دن بہت خاموشی سے گزرے تھے۔  
 اگلے دن اسے اپنی سیٹ پر بیٹھے ابھی کچھ ہی دیر  
 ہوئی تھی کہ اس کا پیغام آ گیا۔  
 ”مسز خان! ریمیل کو میرے آفس میں  
 بھجوائیں پلیز۔“ وہ بے اختیاری میں کہہ گیا تھا۔  
 ورنہ اس سے پہلے وہ ہمیشہ اسے ”مس زیدی“  
 کہہ کر پکارتا تھا۔ لیکن اس بات کا احساس اسے  
 بعد میں بھی نہ ہوا تھا۔ مسز خان کچھ سوچتے  
 ہوئے ریمیل کو دیکھنے لگی اور پھر انہوں نے گہری  
 سانس لیتے ہوئے رسیور رکھا اور اسے مخاطب  
 کیا۔

”جاؤ بھی ریمیل تمہارا بلاؤ آیا ہے۔“ ان  
 کا انداز سنجیدہ تھا وہ پچھلے دو تین دن سے ان کے  
 درمیان خاموشی کو نوٹ کر رہی تھیں کہ نہ تو اس

”کیا پر اہم ہے ریمیل!“  
 ”آں، شک..... کچھ نہیں۔“ انہوں نے  
 بہت کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور اپنی  
 سیٹ پر واپس آئیں۔  
 ”یٹ پچھنی نام وہ ایک محفے میں پھنسی تھی آخر وہ  
 کیا کرے اور کیا بنا کرے۔“

”عبدال تم ابھی تک یہاں کیوں بیٹھے ہو۔“  
 وہ جانے کے لئے اپنے کمرے سے نکلا تھا۔  
 ”وہ جی چھوٹی میڈم ابھی تک آفس میں  
 بیٹھیں ہیں۔“

”خون؟ ریمیل!“  
 ”جی صاحب!“  
 ”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ لیکن پھر کچھ سوچ کر  
 فوراً بولا تھا۔

”نہیں میرا خیال ہے تم رکو جب وہ چلی  
 جائیں تو لاک کر کے جانا اور ہاں یہ لفافہ انہیں  
 دے دینا۔“

”ٹھیک ہے صاحب جی!“ اس نے لفافہ  
 تھا ما اور ماتھے پر ہاتھ لے جا کر اسے سلام کیا تو وہ  
 سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔

”بی بی صاحبہ! یہ بڑے صاحب نے آپ  
 کے لئے دیا ہے۔“

”میرے لئے، کیا وہ چلے گئے؟“  
 ”سب چلے گئے جی، آپ ہی یہاں ہو  
 بس۔“ اس کے بتانے پر خوف کی ایک تیز لہر اس  
 کے اندر دوڑ گئی۔

اس نے لفافہ چاک کر کے کاغذ نکالا اور  
 کھول کر دیکھتے ہی اس کا دل بہت زور سے دھڑکا  
 تھا وہ نکاح نامے کی رجسٹرڈ کاپی تھی۔ اس نے  
 لرزتے ہاتھوں سے اسے بیگ میں ڈالا اور باقی  
 چیزیں سنبھال کر چادر اوڑھتی ہوئی باہر نکل آئی۔  
 گھر واپسی پر وہ جس ہنگامے کی توقع کر رہی تھی  
 دور دور تک بھی اس کے نشان نہیں تھے۔

”اماں کیا ہوا اب تو نہیں آیا۔“ اس کا انداز



نے اسے طلب کیا تھا اور نہ ہی اسے کمرے میں  
گئی تھی ان کے اس گروہ کو وہ بہت خاموشی سے  
جاچ رہے تھے۔ لیکن کوئی سراہا تھا نہیں آ رہا تھا۔  
وہ اس وقت فون پر بات کر رہا تھا جب وہ اندر  
داخل ہوئی۔ وہ کوشش کے باوجود بول نہ پائی تھی  
جب کہ اس نے اسے دیکھتے ہی اثبات میں سر ہلا  
کر اندر آنے کی اجازت دی تھی وہ ٹیبل کے پاس  
پہنچی تو اسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا وہ  
ہاتھ مسلتی نظریں جھکائے بیٹھ گئی۔ وہ فون پر بات  
کرنا مسلسل اسے دیکھ رہا تھا اور پھر اپنی بات  
سمیٹ کر رسیور رکھ دیا۔ اپنے سامنے رکھے اخبار  
کے ایک پرچہ پر ریڈ پین سے ایک جگہ سرکل بنایا  
اور اس کے سامنے رکھ دیا اور ہاتھ کے اشارے  
سے اسے پڑھنے کو کہا۔ اس نے دیکھا وہ ایک  
چھوٹی سی خبر تھی۔

شہر کے رئیس سیٹھ زمان احمد  
خان اس دارفانی سے کوچ کر گئے  
75 سالہ سیٹھ زمان احمد خان کو دو دن  
سے فوج اور دل کا دورہ، ایک ساتھ  
پڑا تھا ہسپتال کے انتہائی نگہداشت  
کے شعبے میں موت و زندگی کی جنگ  
کرتے ہوئے بلا آخر آج صبح اپنی  
جان مالک حقیقی کے سپرد کر دی، ان  
کی نماز جنازہ کل بعد از نماز ظہر ادا  
کئی جائے گی۔

”او ٹھیک گاڈ!“ اس نے خبر پڑھتے ہی  
گہری سانس لیتے ہوئے آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور  
پھر ماتھے پر آئے پسینہ کو صاف کرتے ہوئے سر  
پر آئی کسی ناگہانی کو ہاتھ پھیر کر ہٹایا تھا۔ وہ بغور  
اس کی کیفیت کو جاچ رہا تھا۔ اس کی حالت اس  
وقت ایسی تھی جسے کسی قیدی کو موت کی خبر سنا کر  
چند دن بعد آزادی کا پروانہ اس کے ہاتھ میں  
دے دیا جائے۔ وہ شاید کچھ دیر کے لئے اس کی  
موجودگی اور اس سے بنے تعلق کو بھول گئی تھی،

لیکن پھر ایک کوندا سا لپکا تھا اس کے دماغ میں  
اس نے ایک جھٹکے سے سراٹھا کر اس کی طرف  
دیکھا تو وہ جو اس پر نظر جمائے ہوئے تھا گہری  
سانس لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور دھیرے دھیرے  
چلتا ہوا کھڑکی کے پاس آن رکھا۔ ہر اٹھتے قدم  
کے ساتھ اس کی نظروں نے بھی حرکت کی تھی۔  
تقدیر نے کیسا سنگین مذاق کیا تھا ان کے ساتھ،  
ایک ایسے دور اسے پر لا کھڑا کیا تھا انہیں۔ وہ  
کھڑکی میں کھڑا کسی ان دیکھے نقطے پر نظریں  
جمائے ہوئے تھا اور وہ جیسے اس کے کسی فیصلے کی  
منتظر اس پر، اس نے رخ پھیر کر اس کی طرف  
دیکھا اور پھر کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے  
کہ ایک دم سے دروازہ کھلا اور رضیہ جنید اندر چلی  
آئی اور وہ جو پچھلے چند دنوں سے اس کی حقیقت کو  
فراموش کر بیٹھا تھا چونک اٹھا۔

”ہائے زومی ڈیئر کہاں ہو ڈارلنگ اسے  
دنوں سے“ وہ اس کے قریب آ کر بڑی ادا سے  
بولی تھی اور وہ جس پر کچھ دنوں سے ایک ٹرانس کی  
کی کیفیت طاری تھی جیسے اپنے حواسوں میں ہی  
اب آیا تھا۔ اس لئے اس کے اس طرح بیکار نے  
پر چونک کر اسے دیکھا اور پھر ریمیل کو دیکھ کر گہری  
سانس لے کر رہ گیا۔

”او کے مس زیدی اس براہیم پر پھر ڈسکس  
کریں گے۔“ اس نے پروٹیشنل انداز اپنایا۔ وہ  
اٹھی اور مرے مرے قدم اٹھاتی دروازے کی  
جانب بڑھ گئی۔ اس نے جاتی ہوئی ریمیل کو دیکھا  
اور پھر قریب کھڑی روزی کو۔

کیسی عجیب بات تھی یہ کہ ایک اس کی مگتیر  
تھی دوسری اس کی بیوی قدرت کے اس مذاق پر  
وہ پھٹکی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

”احزم ڈیئر کہاں ہو تم اتنے دنوں سے میں  
تمہیں ٹرائی کر رہی ہوں لیکن تم ملتے ہی نہیں  
موبائل تمہارا آف ہے، گھر جاؤں تو گیٹ کیپر  
بتاتا ہے کہ تم گھر پر نہیں ہو یہاں فون کروں تو تم



اس کے دماغ میں  
اس کی طرف  
ہوئے تھا گہری  
ہیرے دھیرے  
ہر اٹھتے قدم  
حرکت کی تھی۔  
ان کے ساتھ  
تھا انہیں۔ وہ  
نقطے پر نظر  
کے کسی فیصلے کی  
اس کی طرف  
ولے ہی تھے  
جنید اندر چلی  
کی حقیقت کو

انڈر شیڈ۔ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے  
ہوئے کہا۔ جب کہ دونوں کا انداز ایسا تھا جیسے  
کوئی بچہ بیوقوفی کی بات کرے تو بڑے اس پر توجہ  
نہیں دیتے۔ وہ باری باری دونوں کو شعلہ بار  
نظروں سے دیکھتی پیر پختی وہاں سے چلی گئی۔  
اس کے جانے کے بعد اس نے جسے سر ہلا کر خود کو  
کسی بوجھ سے آزاد کیا تھا۔

”آئی ایم سوری مسز خان!“

”نو پرا بلیم۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا اور پھر  
چوکی۔

”وہ میں اس لئے آئی تھی کہ ریمیل یہاں  
سے نکلتے ہی بنا کچھ بتائے کھر چلی گئی ہے۔“  
انہوں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
کیونکہ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی تو اس  
کی حالت دیکھ کر نہ تو وہ کچھ پوچھ پائیں اور نہ ہی  
وہ بولنے کی پوزیشن میں تھی۔

”اوکے، آپ ایسا کریں کہ ان کی دو دن  
کی لیو بنا کر مجھ سے سائن کروالیں۔“ اس نے  
باؤں میں ہاتھ پھیر کر سر کو کرسی کی پشت سے ٹکا  
دیا۔

”ایہی پرا بلیم احزم!“ انہوں نے کھوجے  
کے انداز میں پوچھا کہ وہ عام طور پر ان کے  
ساتھ بہت سی باتیں شیئر کر لیتا تھا لیکن صرف وہی  
جو کہ وہ چاہتا تھا۔

”نو پرا بلیم مسز خان!“

”انگل کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں، مجھے تم  
کافی پریشان لگ رہے ہو۔“  
”جی ہاں وہ بالکل ٹھیک ہیں ابھی صبح ہی  
دونوں سے بات ہوئی ہے۔“  
”تو پھر کوئی اور مسئلہ؟“

”میں نے کہا ناں مسز خان کوئی مسئلہ نہیں  
ہے کوئی پرا بلیم نہیں ہے۔“ وہ ناچلچپتے ہوئے بھی  
جھٹکھٹکھٹا گیا۔ لیکن وہ برا مانے بغیر دیکھتی رہی اور پر  
بڑے سکون سے بویں۔

ان بٹھا۔  
”آئی ایم سوری روز، اس وقت میں  
سہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔“ اس کا لہجہ بہت  
جیسا اور انداز بہت سادہ تھا۔

”کم آن ڈارلنگ ہر وقت کام کام کیوں  
نی جان مارتے ہو تم اتنا کچھ تو ہے تمہارے  
س۔“ وہ پھر اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی آج  
اس کا انداز کچھ زیادہ ہی رومانٹک تھا۔

”پلیز اٹھو ناں۔“ اس نے پھر اس کا ہاتھ  
بے تکلفی سے تھاما تھا جس نے اسے فوراً ہی جھٹک  
لیا۔

”میں نے کہا ناں میں نہیں جا سکتا تمہارے  
ساتھ، پلیز یو کیس گوائنڈ ڈونٹ ڈسٹرب می۔“  
”واٹ از یور پرا بلیم احزم حسن، میں دیکھ  
رہی ہوں کہ تم چند دنوں سے مجھے نظر انداز کر  
رہے ہو آخر کیوں؟“

”آئی ایم بزی۔“ اس نے لاتعلقی سے  
کہا۔

”میں تمہاری مصروفیت کو اچھی طرح سمجھ  
رہی ہوں احزم حسن گیلیانی۔“ اس نے مسز خان  
کے خوبصورت چہرے پر انگارے برساتی نظریں  
ڈالتے ہوئے کہا۔ جو اسی وقت کمرے میں آئیں  
تھیں۔

وہ صرف بہت اچھے موڈ میں ہی اردو کے  
لفظ استعمال کرتی تھی ورنہ عام طور پر وہ انگریزی  
ہی بولتی تھی۔

”لیکن احزم حسن یاد رکھنا میں ایسا ہرگز نہیں  
کرنے دوں گی تم میرے ہو اور صرف میرے



”مسئلہ تو تمہارے ساتھ ضرور کوئی ہے ہاں تم بتانا نہ چاہو تو اور بات ہے۔ لیکن اس طرح اس کی تشہیر بھی مت کرو۔“ انہوں نے اس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہارے چہرے پر ”میں پریشان ہوں“ کا بہت بڑا سائن بورڈ لگا ہے، اوکے وٹس یو بیسٹ آف لک۔“ وہ کہتی ہوئی چلی گئیں۔

ریمل نے احزم کے روم میں جانا بالکل موقوف کر دیا تھا اور اگر چاہتا بھی پڑتا تو وہ کسی نہ کسی کی موجودگی میں جاتی تھی، نظر ملا کر پہلے بھی اس نے بھی بات نہ کی تھی، لیکن اب تو مسلسل نظریں چراپے رکھتی۔ اس وقت بھی رانا صاحب کو اس کے آفس جاتے دیکھا تو موقع غنیمت جان کر وہ ایک اہم فائل اٹھائے چلی آئی۔

”ایسکیووز می سر! پہلے یہ فائل دیکھ لیں“ وہ رانا صاحب کے بیٹھنے اور بات کرنے سے پہلے ہی بول اٹھی اس نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور رانا صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جی فرمائیے رانا صاحب!“ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے کہہ رہا ہو کہ ”آپ نے کیا بالکل احساس نہیں ہے“ وہ اپنی جگہ چوری ہو گئی اور واپس جانے لگی۔

”تشریف رکھیے آپ بھی۔“ اس کا لہجہ برہم تھا۔ اسے آڈر دے کر وہ پھر رانا صاحب سے بات کرنے لگا جو کہ اسے کسی نئے پروجیکٹ کے شروع کرنے کے بارے میں بتا رہے تھے۔ چونکہ سامنے والی کرسی پر بیٹھے تھے اس لئے وہ ریمل کی دائیں سائیڈ پر بھی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ پندرہ، بیس منٹ بعد وہ اپنی بات ختم کر کے جا چکے تھے اور ان کے جاتے ہی اس نے فائل کھول کر اس کے سامنے کر دی پہلے تو وہ خاموشی اور بے دھیالی میں اسے سنتا رہا، لیکن پھر کچھ سمجھ نہ آنے کی صورت میں گردن موڑ کر اس

کی طرف دیکھنے لگا چند منٹوں تک تو وہ نظر نہ کرتی رہی لیکن پھر نظروں کی شدت کو کم کر کے لب بلیچ گئی۔ چند سیکنڈز گزرنے کے بعد ہی جب اس نے اپنی نگاہوں کا زواہیہ نہ بدلا کر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ریمل!“ دو قدم پر ہی وہ اس کی پکار کر سہم گئی تھی۔ وہ اس کی پشت پر آن کھڑا ہوا، ”کیا بات ہے ریمل، کیوں کر رہی ہو؟“ اس کے تسخیر لہجے پر اس طرح سے محسوس۔ اس کے تسخیر لہجے پر اس سائیں اٹک گئیں۔

”کس بات کا ڈر ہے تمہیں جو اس طرح سے چپھتی پھر رہی ہو مجھ سے۔“ وہ چند جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”لک..... کیا مطلب؟“ اس کے

”پر وہ اس کے سامنے آ گیا۔

”تم ابھی طرح سے جانتی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“ اس نے اس کے بیچ چہرے نظریں جمائیں تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”لک..... کیا مطلب کیا سمجھ رہے ہیں آپ۔“

”یہی کہ تم خوف زدہ ہو اور.....“

”پلیز سناپ، اگر آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں تو میں آپ پر واضح کر دوں احزم صاحب! کہ آپ میرے لئے کبھی بھی اہم نہیں رہے نہ آج اور نہ کل اور نہ ہی کبھی آئندہ۔“ وہ برہمی سے بولتی ایک ایک لفظ اس پر واضح کر چلی گئی۔

”میں آپ کے جلد فیصلے کی منتظر رہوں گی۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور پھر سائیڈ سے ہوتی ہوئی چلی گئی۔ وہ وہی کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت میں کھڑا رہ گیا۔



حاصل کرنا تھا۔ وہ اپنی دھڑکنوں پر بند باندھتی تھی اس کے کمرے میں چلی آئی اور بہت خاموشی سے لفافہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کان سے لگا ریور کریڈل پر رکھا اور لفافہ اٹھالیا۔

”کیا ہے یہ؟“ لیکن وہ خاموش رہی کہ بولنے کی سکت وہ خود میں نہ پائی تھی۔

اس نے اسے پڑھا اور پھر انتہائی سنجیدہ نظریں اس پر جماتے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے فریب پڑی روی کی ٹوکری کے نذر کر دیا۔ وہ لب دانتوں تلے دبائے اس کی اس حرکت کو دیکھتی رہی۔ اسی دوران فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی تو ریور کان سے لگانے سے پہلے وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”جاؤ اپنی سیٹ پر بیٹھو جا کر۔“ اس نے تنبیہ انداز اپنایا تو وہ مرے مرے قدموں سے واپس لوٹ آئی۔

لیکن اب اس کے چہرے پر پہلے جیسا اضطراب اور بے چینی موجود نہ تھی اس کے مسرر خان چھٹی اخذ نہ کر پائیں تو فوراً پوچھا۔ ”ہو گیا منظور اسٹافٹی؟“ اس کے لبوں میں سر ہلانے پر وہ مسکرائیں۔

”بتانا پسند کرو گی کہ تم نے یہ بے وقوفی کیوں کی حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اب تمہارا اسٹافٹی ابھی بھی منظور نہیں ہوگا۔“ ان کا لہجہ معنی خیز تھا جسے وہ نظر انداز کرتے ہوئے بولی تھی۔

”میڈم! پلیز آپ میری سیٹ کسی اور ڈیپارٹمنٹ میں ٹرانسفر۔۔۔۔۔“

”تمہارا پرابلم یہ سیٹ نہیں۔“ ان کا انداز لائق لقی لئے ہوئے تھا۔

”جی؟“

”تمہارا مسئلہ یہ ہے مس ریمل افتخار زیدی۔“ وہ اپنی سیٹ سے اٹھیں۔

”ٹھک ٹھک، ٹکا، ٹھک ٹھک۔“ وہ بہت سی ٹاپ رائٹر پر ہاتھ مار رہی تھی کام کرتے ہی اس نے ٹھہری سانس لی تھی۔

”آج وہ آفس محض اسی کام کے لئے کھولی ہوئی۔“ اس نے لفافہ میڈم کے سامنے رکھا۔

”یہ کیا ہے بھی؟“ انہوں نے اسے اٹھا کر کھولتے ہو پوچھا۔

”میرا ریزائن۔“ انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ چونکی۔

”کیا ریگنیشن، مگر کیوں؟“ ”میں یہ ملازمت چھوڑ رہی ہوں۔“ اس نے بہت سوچ سمجھ کر کئے گئے اپنے اس فیصلے کے بارے میں انہیں آگاہ کیا کہ اب اس کے سوا اسے کوئی دوسری راہ نظر نہ آتی تھی۔

”لیکن کیوں ریمل!“ ان کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ”دیکھو ایسی بیوقوفی مت کرو۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر پاس بٹھایا۔

”مجھے بتاؤ کیا پرابلم ہے تمہارے ساتھ، کیا کہیں اور جاب مل گئی ہے۔“ ان کے مشفق انداز پر اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”نو میڈم! ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس اب میں یہاں کام نہیں کر سکتی۔“ اس کی بات پر انہوں نے بغور اسے دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا کاغذ دوبارہ فولڈ کر کے لفافے میں ڈالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

”ٹھیک ہے تم یہ ریگنیشن احزم کے پاس لے جاؤ کیونکہ اسے ہی اس پر سائن کرنے ہیں میں تو کچھ نہیں کر سکتی۔“ ان کی بات پر وہ لب بلیج کر کھڑی ہو گئی کہ آخر اسے یہ کاغذ اس کے سامنے رکھنے کے بعد اپنی آزادی کا پروانہ بھی تو







کوشش مت کریں۔ اس کے کہنے پر وہ خاموشی سے اپنی اس پیاری سی بہن کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”پہلے مجھ سے وعدہ کر کہ تو اس بات کے لئے کبھی ہائی نہیں بھرے گی جس کی وجہ سے مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔“ انہوں نے کہا تو وہ دونوں حیرانگی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے بات ہی ایسی عجیب کی تھی۔  
 ”کون سی بات آپنی؟“

”تو نے میرے لئے اتنا کچھ کیا ہے کہ..... لیکن خوشیاں تو تقدیر سے ملتی ہیں مال و زر سے نہیں اور میں تجھے اپنی وجہ سے برباد نہیں ہونے دوں گی، میرے کون سے بچے برباد ہو جائیں گے پیچھے، جہاں میری ماں نے شوہر کے بغیر ساری زندگی گزار دی میں بھی گزار دوں گی۔“ وہ پھر رونے لگیں اماں نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

”آیا کیا پہیلیاں بھجوا رہی ہیں آپ اصل بات کیوں نہیں بتاتیں۔“ وہ چیخ اٹھی۔

وہ دھیرے دھیرے انہیں سب کچھ بتانے لگیں ساری بات سن کر اسے اپنے حواس م ہوتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ جب سے شادی ہوئی تھی اس کی ساس کے طعنے ہی ختم نہیں ہوتے تھے۔ اسے تنگ کرنا ہی ان کا مشغلہ تھا۔ لیکن پچھلے کچھ دنوں سے انہوں نے ایک دم ہی خوش اخلاقی کا چولا اوڑھ لیا تھا۔ بڑا میٹھا میٹھا بولنے لگیں بہو کا بہت خیال رکھنے لگیں اور اس کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بھی بٹانے لگیں تھیں۔ وہ حیران تھی کہ یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی اور تو اس کا بڑا دیور بھی اس کے آگے پیچھے پھیرے لگانے لگا۔ وہ حیران تھی کہ اس لوئر کو تو اپنے لفٹکے پن سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی کجا کہ ہر وقت کی خوش آمد۔ بہر حال جو بھی تھا وہ اس صورتحال سے خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔ کہ چلو کچھ تو انہیں میری خدمتوں کا احساس ہوا۔ لیکن جلد ہی ان کے

چہرے پر بڑا خود غرضی کا نقاب اتر گیا۔ اس دن چٹن میں کام کرتے ہوئے ساس نے آخر اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”میں تو اب بوڑھی ہو گئی ہوں بنی مجھ سے یہ کام و ام نہیں ہوتے اب، تو اپنا ہاتھ بٹانے والی لے آ۔“ وہ ان کی بات کا مطلب نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے پوچھنے پر دوبارہ گویا ہوئیں۔

”زبیر ماشاء اللہ جوان ہے کام دھندے سے بھی لگ گیا ہے میں چاہتی ہوں اس کی شادی کر دوں۔“

”او۔“ اس نے گہری سانس لی۔  
 ”تو ماں جی نیک کام میں دیر کیسی۔ کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں۔“

”لو بھلا میرے زیر کولڑکیوں کی کمی سے بھلا ایک سے بڑھ کر ایک گھر بڑا ہے اس کے لئے پر میں چاہتی ہوں کہ کوئی ایسی لڑکی لاؤں جو خوبصورت پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ اس گھر میں تمہارا ساتھ ہمیشہ مل کر رہے۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ میرے سب بیٹے ایک چوتھے برسا ایک ساتھ رہیں اور اس میں تیرا ہی بھلا ہے قل جل کر رہو گی مل بانٹ کر کام کر دو گی تو مجھے ہی سکون ملے گا۔“

”بات تو آپ کی ٹھیک ہے ماں جی پر ایسی لڑکی ملے گی کہاں۔“

”لو اور سنو، لڑکی تو اپنے گھر کی ہے۔“ وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”ارے اپنی ریمیل اور کون؟ مجھے تو وہ پہلی نظر میں ہی اپنے زبیر کے لئے بھاگتی تھی اور پھر تو نے ہی بتایا تھا کہ اس کی نوکری بڑی اچھی لگ گئی ہے۔ اچھا کمانے لگی ہے تیرا یہاں بیٹھی کا اتنا خیال کرتی ہے، تو جب بیاہ کر یہاں آ جائے گی تو کتنا کرے گی اور اس دن تیری ماں کا لون بھی تو آیا تھا کہ اس نے فریج اور کمپیوٹر خرید لیا ہے۔ ارے اتنی کماؤ لڑکی کسی اور کا گھر بھرے تو اس



سے بہتر نہیں کہ تو اسے لے آ۔“ وہ بول رہی تھیں اور وہ کہتے کے عالم میں کھڑی آنکھیں بھاڑے انہیں دیکھ رہی تھی۔ تو سے پر پڑی رونی جمل چکی تھی۔

”اور پھر شہزاد کو بھی نجانے کیا پیٹی پڑھائی کہ وہ بھی ان کے ہمنوا ہو گئے ہیں۔ دن رات ایک ہی رٹ ہے، لیکن میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی وہ کہنے لوگ چاہتے ہیں کہ ایک ساری عمر ان کی خدمت کرے تو دوسری کما کر کھلائے اور وہ بیٹھ کر کھائیں۔“ اس نے حقارت سے کہا شاید اس کا پیاناہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ وہ کافی دیر تک اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہی۔ وہ بیچاری نجانے کتنے دنوں سے اس بوجھ کو سینے پر رکھے سو نہ پائی تھی اس لئے آج ساری بھڑاس نکال لینے کے بعد ہلکی پھلکی ہو کر جلد ہی سو گئی، لیکن اسے نجانے کب نیند آئی تھی۔ صبح بھی جلدی ہی آنکھ کھل گئی۔ راجیلہ ابھی سو رہی تھی وہ اسے جگائے بنا آئیں چلی آئی۔

احزم کسی اہم پروجیکٹ کے سلسلے میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ اسے آج رات کو واپس آنا تھا اس لئے وہ یہاں آکر خود کو بہت آزاد محسوس کر رہی تھی۔

شام کو آپی کارویہ کل کی نسبت بالکل مختلف تھا۔ وہ قدرے مطمئن اور مسکراتی ہوئی اس سے ملیں تھیں۔

”اتنی بڑی سلطنت تم نے مجھ سے کیوں چھائی۔“ پہلے تو وہ بھی نہیں اور پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

”میں تو اب انہیں صاف صاف بتا دوں گی کہ جیسا وہ چاہتے ہیں اب ویسا نہیں ہو سکتا اور تم بھی ذرا ہوشیاری سے کام لو یہ کوئی معمولی سی بات ہے کہ جسے تم اہمیت ہی نہ دو۔ قسمت نے اگر ایک بہترین انسان تمہارے نام کر دیا ہے تو اسے اپنے ہاتھ سے جانے مت دینا۔“

”آپا پلیر ایسی فضول باتیں مت کریں۔“

”لو اس میں کون سی فضول بات ہے۔ نکاح ہوا ہے تمہارا یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے۔ شوہر ہے وہ تمہارا حق ہے تمہارا اس پر۔“ ان کی بات پر غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آپی نے کہتی آسانی سے وہ سب باتیں کہہ دیں جنہیں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اٹھ کر الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

”میری باتوں پر دھیان دو تمہیں تو کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔“ اس نے پلٹ کر برہمی سے پوچھا۔

”نہیں، کیوں؟ میرا دماغ نہیں ہے کیا۔ اماں کی تو منطق ہی نرالی ہے، کہتی ہیں۔ میں نے اس کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ معاملہ سنبھلتے ہی وہ خود مختار ہے جو چاہے فیصلہ کرے اگر اس نے برے وقت میں مجبوراً ہمارا ساتھ دیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اس پر مسلط ہی ہو جائیں۔ لو بھلا یہ بھی کوئی کرنے کی بات ہے۔“

”ٹھیک کیا ہے اماں نے اس میں کیا غلط ہے۔“

”لو، تم نے اس کی کنپٹی پر پستول رکھ کر تو نکاح نہیں پڑھوایا ناں آخر یہ سب اس نے اپنی مرضی سے ہی کیا ناں۔“

”آپا، آپ نہیں جانتی کہ اس وقت حالات کیا تھے۔“ اس نے زچہ ہوتے ہوئے کہا۔

”اس کی جگہ کوئی ہوتا تو وہ یہ سب کرنے کے لئے تیار ہو جاتا اور وہ تو اتنا کیسرنگ اور اچھا ہے کہ.....“ اس نے کہتے کہتے زبان دانتوں تلے دبالی۔

”لو یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔“ وہ ہنس دیں اور اس کے قریب چلی آئیں۔

”نکاح کے دو بول چیز ہی ایسی ہے کہ دو اجنبیوں کو ایک کر دیتی ہے۔“ انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیار سے دیکھا جو



تھک بار کر چار پائی پورٹ گئیں۔  
 بیٹھی۔ ”اچھا تو ایسا کر۔“ وہ ایک دم ہی اٹھ

”انہیں بتا دے کہ تیری خالہ رشتہ بکا کر گئی  
 ہے جیسے ہی وہ دونوں باہر سے آئیں گے شادی  
 کر دیں گے۔“

”اللہ کرے اماں ایسا ہی ہو۔“ آئی نے  
 جذب سے دعا کی اور چائے لانی ریمیل کا دل  
 پوری شدت سے ڈوب کر ابھرا تھا۔

نہیں آئی کی باتوں کا اثر تھا یا کچھ اور کہ  
 وہ اگلی صبح آئیں میں وہ پورا دن اس کا سامنا  
 کرنے سے کتراتے رہی تھی۔ عجیب سی گھبراہٹ  
 سوار تھی اس پر اور ویسے بھی وہ دو دن بعد صبح آٹھ  
 بجے کی فلائیٹ سے سیدھا آئیں آیا تھا اور اب صبح  
 سے تمام سینئرز کو اپنے آفس میں جمع کئے وہاں  
 نمائے گئے کام کی تفصیلی جائزہ لینے کے ساتھ  
 ساتھ انہیں آئندہ کے لئے تیار رہ کر رہ کر عمل  
 سے آگاہ کر رہا تھا اور یہ میٹنگ تقریباً مزید ایک  
 گھنٹہ جاری رہی۔ اس میٹنگ میں اس کی  
 موجودگی بھی ضروری تھی لیکن وہ نہیں گئی تھی۔ اثر  
 کام کی تیل پر اس نے بہت خاموشی سے رسیور  
 کان کو لگایا تھا۔

”کم ان مائی روم۔“ اس کی تھکانہ آواز  
 کانوں سے ٹکرائی اس نے کوئی بھی جواب دیجے  
 بغیر خاموشی سے رسیور رکھا اور خود کو میٹنگی اٹھ کھڑی  
 ہوئی۔

”یہ فائل لے جائیں اور ان تمام ڈاکومنٹس  
 کی فوٹو کاپی تیار کریں اور پھر تمام سلائیڈز بنا کر  
 میرے پاس لائیں اور آج ہی یہ سارا کام کاپیٹ  
 کر کے آف کریں گی آپ، اوکے۔“

”لیس سر!“ اس نے دھیرے سے کہا۔ اس  
 کی خاموشی اور کچھ وانداز کا دھیمہ پن اسے چونکا  
 گیا۔ چہرے پر چھائے کسی انجانے سے تاثر نے

اب اپنے اعتراف کے بعد نظر چرائے  
 حیدرہ کی کھڑکی تھی۔

”آپلیز لیو دس ٹاپک۔“ وہ کہتے ہوئے  
 کھڑے اٹھائے کمرے سے باہر نکل گئی اور ہاتھ  
 میں جا بھسی۔ نہا کر کپڑے بدل کر واپس آئی  
 وہ ابھی تک برآمدے میں بیٹھی اسی کی منتظر  
 تھی۔

”بس اب کچھ نہیں بولیں گی آپ اور ہاں  
 آپ اپنے سرال والوں کو کیا بتانا چاہ رہی ہیں۔  
 آپ اگر آپ نے انہیں کچھ بتایا تو اس طرح تو  
 پھیل جائے گی۔“

”تو پھر اس سے کیا فرق پڑے گا۔ اب  
 جنہیں ساری زندگی تو اس قید خانے میں لے  
 کر نہیں ڈالوں گی۔“

”سب کچھ بتاؤں گی تو ہی جان چھوٹے  
 ”اماں سمجھائیں آپا کو۔“ اس نے کچن سے

”راہیلہ اتنا جذباتی ہو کر مت سوچو، جو کچھ  
 سوچ رہی ہو وہ ناممکن ہے۔“

”اماں کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، کیوں  
 ممکن نہیں ہے آخر کس چیز کی کمی ہے ہماری ریمیل  
 میں اور کیا آپ چاہیں گی کہ اپنی اپنی قابل بیٹی کو  
 ایک ٹکھو کے پلے باندھ دیں، میں جب تک  
 نہیں اس کے نکاح کے متعلق نہیں بتاؤں گی وہ  
 لوگ میری زندگی عذاب بنائے رکھیں گے اور  
 اب تو شہزاد بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ زیر اور اس کی  
 بالیہ کارویہ تو بالکل ایسا ہے کہ جسے بات پکی ہو  
 چکی تھی۔“ اماں کے چہرے پر تفکرات کے سائے  
 گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ آئی اپنے آنسو  
 صاف کر رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی  
 اور اماں کی دم کی ہوئی چائے کپوں میں ڈالنے

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ اماں



اسے بغور دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ نظریں چراگئی۔  
چند ثانیے اس نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے  
دیکھا اور اس کے پلٹ جانے پر سر جھٹک کر  
مصرف ہو گیا۔

”او کے گائز میرا خیال ہے کہ آپ سب  
اب تک اپنا اپنا کام سمجھ چکے ہوں گے اور میں  
آپ سے یہ امید کرتا ہوں کہ آپ سب وقت  
سے پہلے اپنا کام کمپلیٹ کر لیں گے۔ مجھے اس  
موقع پر آپ کے تعاون کی بھرپور ضرورت  
ہے۔“

”آف کورس سر!“ وہ سب ہم آواز  
بولے۔

یہ ساری جدوجہد فارن سے ایک ماہ بعد  
آنے والے ڈیلیکیشن کے سلسلے میں تھی۔ اس  
سے میننگ میں کامیابی کے نتیجے میں کمپنی کو  
کرداروں کا فائدہ پہنچنے کے سو فیصد چانسز تھے اور  
وہ یہ چانس کسی صورت میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔  
”او کے، وٹ دا بیسٹ آف لک۔“

”تھینک یو سر!“ وہ سب ایک ایک کر کے  
اٹھنے لگے تو وہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مسز خان! کم ہیئر پلیز۔“ اس نے اٹھ  
کر باہر کی طرف قدم بڑھائی مسز خان کو پکارا تو  
وہ قریب چلی آئیں۔

”ہاں کہو کیا بات ہے؟“

”پلیز ذرا یہ رپورٹ دیکھیں۔“ اس کے  
کہنے پر وہ بھی اس کے ساتھ ہی کمپیوٹر کے سامنے  
جھک گئیں تو انہیں رپورٹ کے متعلق اہم نکات  
سمجھانے لگا لیکن چند ہی منٹ بعد کرسی سے اٹھ  
گیا۔

”آپ پلیز ذرا اسے چیک کریں میں ابھی  
آیا۔“ وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا اور وہ سر ہلا کر اسی  
کرسی پر بیٹھ گئیں۔

اس نے بہت آہستگی سے دروازے کو پیش  
کیا تھا اور بغیر آواز اپنے پیچھے بند کر دیا۔ وہ کرسی

کی پشت پر سر رکھے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی  
اور لرزنی چلیں اندرونی اضطراب کی علامت تھی  
وہ چند لمحے خاموشی سے دیکھتا رہا لیکن جیسے جیسے  
آنکھوں سے ایک آنسو نکل کر اس کے بالوں پر  
جذب ہوا وہ پکار بیٹھا۔

وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی تھی اور تیزی  
چہرے پر بھی آنے والے آنسوؤں کو ہاتھوں سے  
صاف کرنے لگی۔

”اپنی پرابلم۔“ اس کا انداز کھوجتا ہوا تھا  
”نن، نو سر!“

”گھر میں سب خیریت تو ہے نا۔“ اس  
لہجے میں فکر مند تھی۔

”یہ..... لیس سر!“ وہ چند لمحے اسے  
رہا جو اپنے دوپٹے سے اپنا چہرہ خوب اچھی طرح  
رگڑ چکی تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”میں یہاں تمہارا باس بن کر نہیں آیا ہوں۔“ اس  
ہی لہجے میں سرگرمی گردان سننے آیا ہوں۔

چہرے پر موجود نرمی کے تاثرات کی جگہ اب  
لہجے کی تھی۔

”بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟“

”وہ..... وہ آنی کی اپنے سرال  
سے کوئی ناراضگی ہو گئی ہے اور وہ گھر آ  
ہیں۔“ وہ نظریں جھکاتے رک رک کر بولی تو وہ

گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”کوئی بڑا مسئلہ ہے کیا؟“

”نن..... نن..... نہیں تو، مجھے معلوم نہیں۔“  
وہ گھبرا گئی۔

”تمہیں معلوم نہیں یا مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔“  
اپنی وے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں خود معلوم کر لوں گا۔“ وہ جانے کے  
لئے پلٹا لیکن پھر رک گیا۔

”اور ہاں اتنا ناقابل اعتبار بند نہیں ہوں  
جتنا کہ تم مجھے جھٹکتی ہو۔“ وہ کہہ کر پلٹ گیا۔

”بھی اعتبار کا کوئی سرا میرے پاس نہیں  
ہے۔“



جی تو تھا وہ احزم حسن۔ اس کے بے آواز لب  
چلے تھے اور آنکھیں ابھی تک دروازے پر جچی  
تھیں۔

دروازے پر پڑا تالا اسے تشویش میں مبتلا  
کر گیا وہ اپنے پاس موجود چابی سے دروازہ کھول  
کر اندر آگئی۔ ایک طرف رکھا اور چادر اتار  
کر چارپائی پر بٹھ گئی اور پیروں کو سینڈلوں سے  
آزاد کر کے وہ کچھ دیر سر کو تھامے بیٹھی رہی اور پھر  
کچن کے دروازے کے پاس رکھی فرنج میں جھانکا  
لیکن کالبا لب بھرا جگہ دیکھ کر پیاس میں مزید  
اضافہ ہو گیا۔ پہلے وہ گھر آ کر عصر کی نماز ادا  
کر کے لیٹی تو مغرب کے وقت ہی اٹھتی تھی۔ لیکن  
آج پانی پیتے ہی مغرب کی اذان ہو گئی وہ لیٹنے کا  
ارادہ ترک کرتی وضو کرنے کے لئے اٹھ گئی۔ دعا  
کے لئے ہاتھ اٹھائے تو آنسوؤں کے ریلے نے  
اس کی تمام دعاؤں کا گلا گھونٹ دیا۔ کافی دیر رو  
کنے کے بعد دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو وہ جانے  
نماز سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وجود پر چھائے بوجھ  
پن کو دور کرنے کے لئے ہاتھ روم میں دھسی اور  
جب وہ نہا کر نکلی تو، تو اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا  
تھا۔ اب وہ پریشان ہو گئی بالوں کو تولیے سے  
اچھی طرح صاف کر کے تولیے کو تار پر پھیلا دیا اور  
دوپٹہ سج کرتی بیرونی دروازے کی طرف بڑھی  
تاکہ سامنے والے گھر میں رہنے والی خالہ سے  
اباں کے متعلق پوچھ سکے لیکن ابھی دروازے تک  
پہنچی ہی تھی کہ دستک ہونے لگی۔ اس نے فوراً  
دروازہ کھول دیا۔ تو اماں چادر سے پسینہ پونجی  
اندر داخل ہوئیں۔ اس نے سلام کیا اور کوئی بھی  
سوال پوچھنے سے پیشتر انہیں پانی پلایا وہ بھی شاید  
گرمی کی شدت سے نڈھال ہو گئیں تھیں۔

”کہاں چلی گئی تھیں اماں اور آپا کہاں  
ہیں۔“

”چھوڑنے گئی تھی اس کو پتہ نہیں کیسی عورت

ہے اس کی ساس اپنی بیٹی کو کتنا بھی چھپے تو آسان  
سر پر اٹھالے اور دوسروں کی بیٹیوں کا احساس بھی  
نہیں۔“ وہ راحیلہ آپا کی ساس کے متعلق کہہ رہی  
تھیں۔

”تو پھر؟“

”بس پھر کیا بھڑک اٹھی سن کر وہ تو ایسے کر  
رہی تھی کہ جیسے ہم نے دے کر چھین لیا ہو پتہ نہیں  
کون کون سے پلان بنائے بیٹھی تھی۔“

”اچھا سن، میں نے احزم کو فون کیا تھا اس  
سے بات کرنے کے لئے کہہ رہا تھا کہ آپ نے تو  
پلٹ کر خبر بھی نہیں لی۔ بڑا افسوس ہوا مجھے اس کی  
بات سن کر، واقعی کیا سوچتا ہو گا کہ اپنا مطلب نکل  
گیا تو دوبارہ پوچھا تک نہیں پر کیا کروں شرمندگی  
کے مارے سر اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہی میں  
تو۔ اب سوچی ہوں تو واقعی اپنا فیصلہ غلط لگتا ہے۔  
حالات اور جذبات کی رو میں بہہ کر بہت جذباتی  
ہو گئی تھی میں۔“

ان کا یہ ملال تو کسی طور بھی کم نہ ہوتا تھا۔ وہ  
اپنے طور پر اپنی بیٹی کی زندگی تباہ کر چکی تھیں۔  
چاند کی طلب ان کی فطرت میں بھی نہیں رہی  
تھی۔ لیکن پھر بھی خوفزدہ تھیں کہ ایسی باتیں چھپی  
تو نہیں رہتی۔ پھر کوئی کنواری متعلقہ سے شادی  
کرنے پر تیار ہو گا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جو  
کہ وہ کسی طور حل نہ کر پائی تھیں۔ وہ خاموشی سے  
ان کے سامنے سے اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ اسی دم  
گاڑی کا مخصوص ہارن سنائی دیا تو اس کا دل بہت  
زور سے دھڑکا تھا اور ٹانگوں میں اتنی سکنت بھی نہ  
رہی تھی کہ وہ ایک قدم ہی اٹھا پائی۔ ہاتھوں میں  
لرزش پیدا ہوئی تو تو اتارنے کے لئے جو رومال  
اٹھایا تھا واپس وہیں رکھ دیا اور ماتھے پر آئی پسینے  
کی بوندوں کو ہاتھ سے صاف کیا۔ وہ خود کو بھی نہ  
سمجھ میں آنے والی کیفیت کا شکار تھی وہ ہر روز اس  
سے ملتی تھی ہر روز اس کے حکم پر ڈھیروں کام  
انجام دیتی تھی لیکن وہ آفس تھا اور یہ گھر۔



”آفس میں تو وہ اس کا باس تھا لیکن گھر

میں.....“  
اماں بچن کی طرف چلی آئیں۔  
”ڈرائیور آیا ہے احزم کا گاڑی لے کر۔“  
ان کے ایک ہی جملے پر اس کا رکا ہوا سانس بحال  
ہوا تھا۔  
”مجھے بلایا ہے اس نے۔“ وہ خاموشی سے  
انہیں دیکھتی رہی۔

”تو پھر کیا جواب دوں اسے۔“  
”میں کیا کہہ سکتی ہوں اماں، ابھی تو آپ  
آئیں ہیں اتنا تھک کر۔“

”مجھے کون سا پیدل جانا یا بسوں کے دھکے  
کھانے ہیں۔“ ان کے جواب پر اس نے ان کی  
طرف دیکھا وہ جانے پر آمادہ نظر آئیں تھیں۔  
”مرضی ہے آپ کی، آپ کا موڈ ہے تو چلی  
جائیں۔“ اس نے لائق اختیار کی۔

”میرا خیال ہے کہ چلی جاتی ہوں آخر  
بات کسی پار تو لگے۔“  
”تم چلو گی؟“

”میں، نہیں میں کیا کروں گی جا کر ویسے  
بھی مجھے بہت کام ہے۔“ اس نے قطعی لہجے میں  
کہا۔

”اچھا پھر میرے لئے روٹی نہ ڈالنا۔“ وہ  
شاید خود بھی یہی چاہتی تھیں کہ وہ نہ جانے اپنے  
تئیں۔ وہ ان دونوں کا سامنا نہ ہونا ہی بہتر خیال  
کرتیں تھیں کہ ایک حماقت وہ تو کر ہی چکی تھیں  
لیکن اب نہیں چاہتی تھیں کہ دوسری حماقت ان کی  
بٹی سے بھی ہو۔ لیکن حماقتیں تو از خود سرزد ہوتی  
ہیں بس۔ کسی کا اس میں کیا دوش۔

-----  
”مس ریمیل افکار زیدی، کیا آپ میرے  
کمرے میں آنا پسند فرما میں گی۔“ اس کے تندو  
تیز لہجے پر کل شام سے اس پر چھائی گھبراہٹ  
میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کے کمرے سے باہر

بھی ایک دو بار اس کا اس سے سامنا ہوا تھا لیکن  
کمرے میں جانے کی خود میں ہمت نہ پائی تھیں  
کیونکہ وہ جو اپنے حلقے میں بہت خوش اخلاق اور  
ہنس مکھ جاتا جاتا تھا۔ گزشتہ کچھ عرصے سے اس پر  
ایک جمود کی سی کیفیت طاری تھی ایک سنجیدگی پر  
کہ اس کی فطرت تو نہ تھی لیکن اب اس کی شخصیت  
کا حصہ بن چکی آج صبح سے اس میں مزید اضافہ  
ہو چکا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوتی تو وہ کچھ لکھنے میں  
مصروف ”جی تشریف رکھیے“ مصروفیت کے  
باوجود لہجہ سخت تھا۔ وہ کرسی پر خوف سے دھرتے  
دل کو قلمبوں میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی  
اس کو تو بھی اس کے مسلسل چلتے ہاتھ کو دیکھ رہی  
تھی اور پھر اس نے فل اسٹاپ کرتے ہوئے  
گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا

لی  
”جی تو، مس..... ریمیل..... افکار.....  
زیدی“ اس نے اس کے پورے نام کو چبا چبا کر  
ادا کیا تھا۔

”یا پھر اگر، آپ تسلیم کریں تو ”مسز احزم  
حسن گیلانی“ اس نے اس پر نظریں گاڑتے  
ہوئے کہا تو اس اچانک حملے پر وہ گڑبڑا کر اس کی  
طرف دیکھنے لگی اور پھر فوراً ہی اپنے سرخ ہونے  
چہرے کو لب بھیج کر جھکا گئی۔

”کیوں کیا کچھ غلط کہا میں نے۔“ اس کی  
بات کے جواب میں وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹھ جاؤ ریمیل۔“ اس نے آہستہ لیکن سرد  
صے انداز میں کہا تھا۔ وہ رات سے ایک ان  
دیکھی آگ میں جل رہا تھا اور نجانے کیوں وہ  
اسے بھی اس آگ میں بھسم کر دینا چاہتا تھا۔ وہ  
اس کے کہنے کے باوجود نہ بیٹھی تھی کہ وہ اس  
صورتحال کا سامنا نہ کر پار ہی تھی وہ اٹھ کر اس کے  
قریب چلا آیا تو ٹانگوں میں سکت نہ پاتے ہوئے  
وہ کرسی پر گری گئی۔



حسن گیلانی۔ "اس نے تمہیہ لہجے میں کہا۔  
 "میرا جو نام ہے میرے لئے وہی کافی  
 ہے۔" اس نے دھڑک انداز میں کہا۔  
 "ہے یا تھا۔" کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں  
 پر مسکراہٹ درآئی تو وہ پھر گڑبڑا گئی۔  
 "پلیز فار گاڈ سیک، آپ کو جو کرنا ہے  
 کیجئے۔" اس نے آنکھوں کو انگلیوں سے ڈھانپ  
 لیا۔

"اچھا چلو تم خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو کہ تم  
 اگر میری جگہ ہوتی تو کیا فیصلہ کرتیں۔"  
 مجھے زبردستی کسی پر مسلط ہونے کا کوئی  
 شوق نہیں ہے۔" اپنی کم مائیگی کا احساس اسے کسی  
 مل چین نہ لینے دیتا تھا۔ وہ آج بھی اس کے  
 قدموں میں رکھی ہوئی اپنی ماں کی چادر اور اس  
 کے سامنے جھکے سر کو ایک لمحے کے لئے بھی نہ  
 بھول پائی تھی۔ اپنے احساسات چھپانے کے  
 لئے اس نے نخوت خیز انداز اپنایا تھا۔ وہ بہت  
 خاموش اور بے تاثر انداز میں اسے دیکھنے لگا اور  
 پھر ایک دم فوراً آنے والے غمے کو کنٹرول کرنے  
 کے لئے ہونٹ پیچنے لگے اور کرسی سے اٹھ کر پشت  
 پر جا کھڑا ہوا۔

"زبردستی تم پر مسلط ہونے کے لئے میں  
 خود تمہارے پاس نہیں گیا تھا ریمیل بی بی تم خود  
 چل کر آئیں تھیں میرے پاس۔" اس نے ایک  
 ایک لفظ بہت سرد سے لہجے میں ادا کیا تھا وہ  
 چونک کر سر اٹھائے اسے دیکھنے لگی لیکن فوراً ہی  
 آنکھوں میں دھند اتر آئی۔ اس کی کو چھپانے کے  
 لئے اس نے فوراً ہی گردن جھکا لی۔ جو بات اس  
 نے اپنے حوالے سے کی تھی وہ اسے اپنے لئے  
 سمجھ بیٹھا تھا۔ لیکن اب اسے وضاحت دینے کی  
 کوئی ضرورت نہ تھی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی  
 ہوئی۔

"جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ مدد کی بھیک  
 مانگتے ہم ہی آپ کے در پر پہنچے تھے۔ لیکن اب

"تو پھر اب کیا سوچا ہے تم نے۔" اس  
 نے پھر سے ہوئے سنجیدہ سے لہجے میں پوچھا۔  
 لیکن شاید وہ ابھی تک خود کو سنبھال نہ پائی تھی۔  
 "میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے۔" وہ چند  
 لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔  
 "مم..... میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"  
 "کیوں؟" وہ اس پر نظریں جمائے بیٹھا

تھا۔ "زندگی تمہاری، فیصلہ بھی تمہارا ہونا  
 چاہیے۔"

"اپنی زندگی کے فیصلوں کا اختیار اگر مجھے  
 ہوتا تو میں اس حق کو پہلے استعمال کرتی۔" شاید وہ  
 سنبھل گئی تھی۔

"اب جو بھی کرتا ہے آپ کو کرنا ہے کیونکہ

اب تمام اختیارات آپ کے پاس ہیں۔"

"اچھا فرض کرو فیصلے کا اختیار تمہارے پاس  
 ہے پھر تمہارا کیا فیصلہ ہوگا۔" اس نے سچ جو انداز  
 اپنایا۔

"جس بات کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو اسے  
 میں کیوں فرض کروں۔" اس کے جواب پر وہ چند  
 لمحے خاموش رہا۔

"اوکے۔" اس نے اپنے سامنے رکھے بڑا  
 راکائڈ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ دوپور بیپہ  
 صرف دو جملوں سے بھرا تھا۔

"مس ریمیل افتخار زیدی یا مسٹر احزم حسن  
 گیلانی، اس میں سے ایک جملہ چوز کر لو فیصلہ خود  
 بخود ہو جائے گا۔"

وہ پوری توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا اس نے  
 گھبرا کر چہرے پر آئے پسینے کو صاف کیا۔ اس  
 کے ہاتھوں کی لغزش بہت واضح تھی۔

"مم..... میں چلتی ہوں۔"  
 "کیوں؟ میں نے کوئی مشکل کام نہیں کہا تم  
 سے۔ بیٹھ جاؤ یہ لوپین، نشان لگاؤ۔"

"مس ریمیل افتخار زیدی یا پھر مسٹر احزم



مجھے طلاق کے پتھر پر آپ کے سائن جلد از جلد چاہیے کیونکہ مجھے سرسبز حزم گیلانی سینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں مس افتخار زیدی تھی اور رہنا چاہتی ہوں۔ اس نے کیلے انداز میں کہا اور بنا رکھے چلی آئی تھی۔

عجیب بے چینی اور بے کلی پھیلی تھی اس کے اندر وہ خود ہی اپنی اس کیفیت کی وجہ جانتا نہیں چاہتی۔ فارن سے آنے والا وفد دو ماہ کے لئے ڈیلے ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے فوراً ہی تین دن کی چھٹی لکھی اور گھر آ گئی۔ لیکن گھر کا دروازہ پار کرتے ہی اسے بہت زور سے جھٹکا لگا تھا۔

راحیلہ آپنی اماں کی گود میں سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی اور رونے سے اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ اماں بالکل سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھیں۔ وہ جھنجھلا کر پڑ بڑائی۔ وہ سکون کی تلاش میں سچ ٹائم ہوتے ہی گھر آ گئی تھی لیکن شاید سکون ان کی زندگیوں سے ختم ہو چکا تھا۔ اس نے بہت اکھڑ لہجے میں سلام کیا تو وہ دونوں جیسے ہوش کی دنیا میں لوٹیں تھیں اماں نے چونک کر اسے دیکھا اور راحیلہ بھی منہ صاف کرنی سیدھی ہوں۔

”اب کیا مسئلہ ہے۔“ اس کا لہجہ بہت روکھا پھیکا سا تھا۔

”تم اتنی جلدی؟“

”ہاں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں آرام کروں گی اور پلیز مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔“ وہ اجنبی سی نظر ان پر ڈالتی آگے بڑھ گئی اور راحیلہ کے رکے ہوئے آنسو اس کی اس قدر لالچلی پر ایک دفعہ پھر بہہ نکلے۔

”ہاں آخر کب تک وہ میرے ہی مسائل سلجھاتی رہے گی۔“ وہ شام تک کمرے سے باہر نہ نکلی تھی۔ کمرے کا بند دروازہ ان کے لئے تشویش کا باعث بنا تھا اور جب یہ تشویش حد سے بڑھی تو اماں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک

دے دی۔

”ریمیل آٹھو بیٹا عصر کا ٹائم بھی نکلا جا رہا ہے۔“ اور وہ جسے ڈھیر سارا رونے کے بعد بکھل چکی تھی اپنے آغوش میں لیا تھا۔ اتنی جلدی اٹھائے جانے پر کوفت میں مبتلا ہو گئی۔ وہ کسلندی سے لیٹی رہی لیکن دوبارہ دستک پر اٹھنا پڑا بہت مشکل تمام جسم کو ہیشی دروازے تک آئی اور چٹنی کر لیا کہ دوبارہ بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

”کیا ہوا میری بچی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ انہوں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ہال بٹائے۔

”ٹھیک ہوں میں اماں اتنی جلدی کیوں کر دیا مجھے۔“ وہ سستی سے بولی۔

”جلدی کیوں بیٹا اب تو مغرب ہونے والی ہے۔“

”کیا، مغرب۔“ ایک دم ہی اس کی ساری سستی اڑ چھو ہوئی۔

”تو اور کیا میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی کہ نجانے کیا بات ہوئی۔“

”او مائی گاڈ! دو نمازیں رہ گئیں میری، پہلے کیا کم نحوست ہے ہمارے گھر میں۔“

”بری بات بیٹا ایسے نہیں کہتے۔“

”تو اور کیا کہوں پریشانیوں اور مصیبتوں نے رستہ ہی تو دیکھ لیا ہے ہمارے گھر کا۔“ ایک دفعہ پھر اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”نہیں میری بچی یہ پریشانیاں، مصیبت نہیں آزمائش ہے ہمارے لئے۔“

”آزمائش نہیں عذاب کہیے اماں۔“

جھنجھلا کر اٹھی اور الماری سے کپڑے نکالنے لگی اور باہر بیٹھی راحیلہ اپنے لب کاٹ کر رہ گئی۔

کپڑے لئے جب کمرے سے باہر نکلی تو ٹھیک کر رک گئی۔ لیکن وہ رخ موڑ کر کچن میں چلی گئیں تو وہ گہری سانس لیتی ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

کرتلی تو گرما گرم چائے کا کپ اس کا منظر تھا



خلق میں اتارتے ہی ساری تھکن اور جسم کا  
سپن نہیں دور جاسویا۔

آئی کے لئے انہوں نے انتقامی طور پر جو  
کھڑا کیا تھا وہ کوئی بہت انہونا نہیں بلکہ بہت  
تکلیف دہ تھا۔ نجانے وہ لوگ شادی کے ڈھائی  
گزرنے کے بعد اب تک کیسے خاموش

”آؤ، آؤ، تو گئی ہے پھر کان کھول کر سن لے  
چند دن کے اندر اندر بچہ پیدا ہونے کے آثار  
نہ آئے تو سمجھ لینا تمہارا اس گھر سے دانہ پانی  
میں اپنے بیٹے کی دوسری شادی کر دوں  
اور ایسی بھولاؤں کی کہ دنیا دیکھے گی۔“ وہ ان  
بیانات پر انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ اسے یاد تھا کہ  
وہ اس گھر میں دہن بن کر آئی تھی تو رشتے  
بوں اور محلے والوں نے دانتوں میں انگلیاں  
بلیں تھیں۔

”ارے صغرا کہاں سے ڈھونڈ لی ہے تو نے  
جی چاندی بھو اور رنگت تو دیکھو جیسے دودھ ملائی  
نمازیں رہ گئیں میری بھائی ہو۔“

”ہائے خالہ بال تو دیکھیں بھابھی کے۔“  
یہ نہیں کہتے۔“ شوخ سی لڑکی نے سر سے دوپٹہ کھسکتے ہی اس

”ہونہہ دیکھا کیسے جل گئیں ساری کی  
ساری۔“ ان سب کے جانے کے بعد اسی ساس  
راہے تھی۔

”کہتی تھیں تمہارے بی اے پاس کلرک  
کون سی حور پری ملے گی۔ لو میری بہو کم ہے  
کسی حور سے۔“

اور اب اسی حور پری میں اسے ہی کیڑے  
نہ لگے تھے۔ حالانکہ کیڑے تو اس نے  
لے لے کر باہر نکالے تھے اس گھر کے صرف ایک ہفتہ بھی ہی  
جوت دیا تھا اسے گھر کے کاموں میں۔ پھر گھر  
کی صفائی کے دوران جو گند برآمد ہوا تھا الامان  
کے کپ اس کا

اور جلد ہی اس کی وجہ بھی اسے سمجھ آگئی تھی۔ ساس  
کیبل کی شوقین تو اس سے ایک دن پہلے رخصت  
ہونے والی نند سیر جانے کی۔ چہ مروت پر مشعل  
یہ گھرا تا برا نہ تھا جتنی کہ اس کی حالت تھی۔ اس  
نے اپنا سارا غصہ گھر میں کام کرنے والی اور جو عمر  
سی ماسی پر نکالا تھا۔ چونکہ اپنی بھاری کی وجہ سے کئی  
دن غائب رہتی تھی اور آخر تک آکر اس نے  
اسے جلد ہی فارغ کر دیا۔ شہزاد سے چھوٹا زبیر تو  
سارا دن گھر اور محلے سے غائب رہتا تھا۔ البتہ  
زبیر سے چھوٹا زاہد خاصا منہ پھٹ اور بدتمیز تھا۔  
سارا سارا دن بیٹھک کا دروازہ کھول کر دو چار  
آوارہ دوستوں کو بٹھائے فل والیوم میں ڈیک  
لگائے بیٹھا رہتا۔ شام ہوتے ہی چار پانی باہر اور  
چھوٹی سی گلی میں سے گزرنے والوں کا جتنا دھج  
ہو جاتا۔ سکول اور کالج کی چھٹی ٹائم گلی کی گز پر  
کھڑے ہو کر آتی جاتی لڑکیوں کو گھورتا اور  
آوازیں کسنا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ چند دن  
تک تو اس نے یہ سب برداشت کیا تھا لیکن پھر  
آہستہ آہستہ وہ شہزاد کی توجہ گھر کی مسائل کی طرف  
دلانے لگی جو کہ محض کمانے والی شہین بن کر رہ گیا  
تھا۔ وہ دے دے لفظوں میں اسے اس کے  
مشاغل سے آگاہ کرنے لگی وہ شکایت نہیں لگائی  
بلکہ غیر محسوس انداز میں اس کی حرکتوں سے مطلع  
کرتی۔ شہزاد خود تو سارا دن آٹس اور پھر اور ٹائم  
کر کے اس کا پیٹ پالتے تھے ان کی آمدنی کوئی  
ایسی کم بھی نہ تھی کہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو  
بھی پورا نہ کیا جاسکتا۔ لیکن بغیر کسی منصوبہ بندی  
کے خرچ کرنے کی عادت کی وجہ سے مہینے کے  
آخر تک قرض لینے پر مجبور ہو جاتے اس نے جلد  
ہی سارا حساب کتاب اپنے ہاتھ میں لے لیا  
ساس تو شاید پہلے ہی اس ذمہ داری سے گھبرائی  
ہوئیں تھیں اس لئے بلا چوں چراں سب کچھ اس  
کے حوالے کر دیا اور دیے بھی ہر وقت گھر میں  
رہنے کی وجہ سے گھر کا سودا سلف لانا تو زاہد کی







لوگوں کی خاطر اور تم لوگوں کی نظروں میں میری بیوی کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔“  
”تو بچے اس میں میرا کیا قصور ہے، اس کو خیال رکھنا چاہیے تھا ناں، اب بیچارے کی شرٹ کا بٹن ٹوٹا ہے تو کیا کرے جلدی میں ہو گا دیر ہو گئی اور غصے میں کہہ بیٹھا اس طرح۔“  
”کیوں؟“ وہ پھر گر جا۔

”جب آپ ماں ہو کر اپنے بچوں کی ضرورتوں کا خیال نہیں رکھ سکتیں تو وہ کیوں کر۔“  
”ٹھیک ہے بس بہت ہو گئی اب مزید نہیں دیکھ سکتا یہ سب، میں آج ہی کرائے کا کوئی گھر دیکھتا ہوں، جس گھر میں میری بیوی کی کوئی عزت نہیں اس گھر میں رہنا حرام ہے میرے لئے۔“

سب کے ساتھ ساتھ راحیلہ نے بھی چونک کر دیکھا تھا اسے جب سے شادی ہوئی آج پہلی بار وہ اس قدر غصے میں دیکھ رہی تھی وہ بڑے محل اور صبر والے انسان تھے اور ماں کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنا تو ان کی سرشت میں شامل ہی نہ تھا اور آج آسمان کو چھوتا ہوا ان کا غصہ اسے بھی اندر سے لرزا گیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اطمینان اور سرشاری کی سی کیفیت بھی دل میں در آتی تھی۔

”ہائے ناں میرے بچے کیسی باتیں کر رہا ہے تو اور زاہد شرم نہیں آتی تجھے چل معافی مانگ بھابھی سے۔“ ماں نے زاہد کے سر پر چپٹ لگائی وہ بھی سر جھکائے آگے بڑھا کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ باپ کے بعد بڑے بھائی نے ان کے لئے کیا کیا کچھ کیا تھا اور پھر وہ تو بہت شفیق اور مہربان بھائی تھے۔ اگر ان کی جگہ ان کا باپ بھی ہوتا تو شاید اس طرح ان کے لئے اپنا دن رات کا سکون برباد نہ کرتا جتنا کہ انہوں نے کیا تھا اور پھر بھابھی بھی کچھ کم تو نہ تھیں۔ اپنے محلے کے بہت سے گھروں کی داستانیں اس کے سامنے تھیں۔ وہ

بھی اگر چاہتیں تو ان کا حصہ بن کر ان کے بھائی کو ان سے جدا کر سکتیں تھیں لیکن اس کے برعکس انہوں نے ایک سال کے اندر انہیں ان کی اور ان کے گھر کی حالت بدل کر رکھ دی تھی۔ اگر بھائی گھر چھوڑ کر چلے گئے تو پھر کیا ہوگا۔

”آئی ایم سوری بھابھی جان! مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے کچھ صدق دل سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔

”کوئی بات نہیں زاہد اتم میرے چھوٹے بھائی ہو میرا کوئی بھائی نہیں ہے لیکن تم سب کو میں نے بھائی ہی سمجھا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جایا کرے تو بڑی بہن سمجھ کر معاف کر دیا کرو۔“

ایک تو وہ فطرتاً ہی نرم مزاج تھی اور دوسرے اسے اس سے دشمنی نہ کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نظر نہ آیا تھا لیکن اس کے دل میں جیسے گھر سے بندھ گئی تھی۔ جو بیٹا بھی ان کے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولا تھا آج اس کی وجہ سے ان کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ پہلے انہوں نے ان کے کام میں بھی روک ٹوک نہ کی تھی اپنے زیادہ تر کام وہ خود ہی کر لیتی تھیں لیکن اب آہستہ آہستہ وہ اس کے ہر کام میں دل دینے لگیں۔ بات بے بات ٹوکنے لگیں اس کا کیا ہوا کوئی کام انہیں پسند نہ آتا پہلے تھوڑی تھوڑی اور پھر شہزادے اس کی شکایتوں کا سلسلہ دراز ہونے لگا۔ پہلے ایک سال میں اسے گھر کے کام بھی بوجھ نہ محسوس ہوئے تھے لیکن اب وہ جھکنے لگی تھیں۔ شہزاد کو اس سے شکایتیں رہنے لگیں تھیں ماں کے احساس دلانے پر انہیں پتہ چلا کہ گھر کے کام اتنے نہیں ہوتے بس تمہیں نظر انداز کرنے کا بہانہ ہے اور پھر ریل کے رشتے کی بات شہزاد کو وہ پیاری سی سمجھی ہوئی لڑکی اپنی بہنوں کی طرح عزیز تھی اور اس پر امی کی تجویز کوئی ایسی بری بھی نہ تھی۔ کوئی اور نہ جانے کیسی ہولی دونوں بیٹیاں ہوں گی تو گھر جنت کا نمونہ بن جائے گا۔ لیکن یہ



بات راحیلہ کے لئے قابل قبول نہ تھی۔ انہوں نے ہر طریقے سے اسے منانے کی کوشش کی تھی وہ نہ مانی تو جیسے انہیں بھی ضدی ہو گئی اور وہ اسے چھوڑ آئے اور اس کے جانے کے بعد وحشتوں نے آن گھیرا تھا وہ ان کی تنہائیوں کی ساتھی تھی کتنے ڈھیر سارے دکھ تھے جو اس نے اپنے دامن میں سمیٹ کر اسے خوشیاں اور محبتیں بخشیں تھیں۔ کتنی فکروں سے آزاد کر رکھا تھا اس نے انہیں اور اب ماں بھائی کا مطالبہ۔

”کیا وہ لوگ مان جائیں گے۔“  
کہاں ریمیل جیسی پڑھی لکھی سبھی ہوئی لڑکی جس نے ڈھیروں ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اٹھا رکھیں تھیں اور کہاں ان کا انٹر میڈیٹ بھائی جو سارا سارا دن نجانے کہاں کہاں جھل خوار ہوتا رہتا تھا رات گئے گھر لوٹتا اور دوپہر تک سوتا۔ کیا وہ اس کے قابل تھا۔ تھی تو زیادتی لیکن نجانے کیوں انہیں ریمیل کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے یہ یقین تھا کہ وہ اسے سیدھی راہ پر لے آئے گی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر ممکن طریقے سے وہ لوگ مان جائیں اسی لئے تو انہوں نے راحیلہ کو اتنی بڑی دھمکی دی تھی۔

”ہم شہر کے لئے بر راضی ہوں تو تم بھی اس گھر میں آ سکتی ہو ورنہ تمہارے لئے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔“

اور جب وہ اسے دروازے پر ہی چھوڑ آئے تھے تو اس کا اداس اور ویران چہرہ پر برستے آنسو انہیں اپنے دل کی سرزمین پر گرتے محسوس ہوئے اور اس سے پہلے کہ ان کا دل نرم پڑتا وہ وہاں سے چلے آئے تھے اور اگر وہ نہ مانے اور وہ نہ آئی تو کیا وہ اس کے بغیر رہ سکتے تھے؟ ماں نے بھی بھی اسے لانے پر راضی نہیں ہوں گی۔

”اگر ہمارا کوئی بچہ ہوتا تو.....“ وہ ایک دم چوٹے تھے۔

زندگی اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ انہیں کبھی اتنی بڑی کمی کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ وہ دودن تک آس نہ گئے تھے۔ سارا گھر الٹا پڑا تھا، اماں بڑبڑاتی پھر تیں تھیں۔

”آج بچے ہوتے تو اتنا نہ اکڑتی وہی کٹھن کی شادی بھی تو تمہارے ساتھ ہوتی تھی وہ دوسرے بچے کی ماں بننے والی ہے اور یہاں کوئی آثار ہی نہیں۔“ اور اماں کی یہ باتیں ان کی وحشتوں میں مزید اضافہ کر گئیں۔ انہیں دودن وہ صدیوں پر محیط لگے تھے اور شاید یہ ان کے دل کی شدتیں ہی تھیں کہ وہ تیسرے دن اپنی اماں کے ساتھ چلی آئی تھی، لیکن جو خبر اس نے سنا تھی امی کو مزید بھڑکا گئی تھی۔ اس کی اماں کے باہر لپکتے ہی امی نے آسمان سر پر اٹھالیا یہاں تک کہ وہ اسی وقت اسے لے کر لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئے۔ لیکن علاج مہنگا اور فیس بہت زیادہ تھی۔ امی نے تو سستے ہی طوفان اٹھا دیا۔

”نہیں ہے ہمارے پاس اتنا پیسہ، جاؤ جا کر ماں سے ہو علاج کروائے تمہارا، اسے بیٹیاں پیدا کرنے کا بڑا شوق تھا ان کے علاج کے لئے پیسہ خرچ کرتے جان نکلتی ہے۔“ اور پھر ان کے ہر ممکن دفاع کے باوجود ان کی ساری کوشش بے سود رہی تھی اور وہ ناچاہتے ہوئے بھی اگلے ہی دن اسے دوبارہ چھوڑ جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

”ریمیل! تمہارے پاس کچھ پیسے ہوں گے؟“ وہ اس وقت کپڑے پر لیس کر رہی تھی کہ اماں خاموشی سے بیڈ پر آن بیٹھی تھیں اور بہت متذبذب سے انداز میں بنا تمہید باندھے سوال کیا۔

”جی اماں کیوں خیریت۔“

”ہاں بس جس لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا ہے اس کی اپنی فیس تو مناسب ہی ہے لیکن علاج اور دوائیوں کا خرچ بہت زیادہ ہے۔“



بتایا کہ میں لندن جا رہا ہوں ہو سکتا ہے مجھے چند دن ادھر رکنا پڑے۔

تو نہیں تھا ان کے جانے کا، مہم..... میرا مطلب ہے کہ ان کے فادر یا مدر تو حیرت سے ہیں ناں۔ وہ جتنی معنوں میں پریشان تھی۔

آئی ڈونٹ نو، اس نے کچھ نہیں بتایا، یا شاید وہ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا بٹ آئی تھینک۔ یقیناً کوئی ایمر جیسی تو ہی وہ یوں اچانک چلا گیا۔

”میڈم! پلیز ان کا کوئی کوشٹ نمبر؟“ اس سے پہلے کہ وہ اپنا بیگ اٹھائے کمرے سے باہر نکلتی اس نے فوراً پوچھا۔ وہ ٹاڈاٹھکی میں اپنا آپ عیاں کر رہی تھی۔ انہوں نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا ہے چینی اور پریشانی اس کے ہر ہر انداز سے واضح تھی۔

”اور تو کوئی نہیں اس کا سیل نمبر سے جو کہ یقیناً تمہیں معلوم ہو گا۔“ انہوں نے مسکرا کر معنی خیزی سے کہا لیکن وہ اپنی پریشانی میں محسوس نہ کر سکی۔

”نو میڈم! مجھے نہیں معلوم، کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ اس نے صفائی بیان کی تو انہوں نے ایک چھوٹی سی پرچی پر لکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔

اور اب صبح سے ٹرائی کر کے اس کی انگلیاں شل ہو گئیں تھیں، لیکن اس نے اپنا سیل شاید آف کر رکھا تھا۔ بے چینی اور پریشانی کے باعث وہ آج کوئی کام ہی نہ کر پائی تھی اور کام، کام تو آج صبح سے شاید پورے آفس میں ہی نہ ہوا تھا۔ اتنے دنوں کی بھاگ دوڑ سے شاید سب ہی تھک چکے تھے۔ مسرز خان کو بھی اپنے تمام ضروری کام آج ہی یاد آئے تھے۔ اپنی تمام فرینڈز اور ملنے جلنے والوں کو لمبی لمبی کالز کی تھیں اور پھر جلدی آفس سے چلی گئیں۔ ان کے جانے

سوچ آف کر کے ان کے قریب آن بیٹھی۔ آپ فکر نہیں کریں اماں، بس کسی اچھی ڈاکٹر سے علاج کروائیں آپنی کا اور فی الحال یہ رکھیں باقی میں کل بینک سے لے آؤں گی۔ اس نے انہیں پیسے تھمائے تو وہ اس پر ہنس بھائے اسے دیکھتی رہیں۔

پھر میں نے کیا تھا ان آنکھوں میں کہ وہ گہری سانس لے کر نظریں چراتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے آنکھوں میں آئی نمی کو اندر دھکیلا اور سر پر ہاتھ پھیر کر کمرے سے نکل گئیں اور سر کو ہلکی سی جنبش دیتی دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی ٹیسٹ اور دواؤں وغیرہ پر ہی دوہیوں میں اچھا خاصہ خرچ آیا تھا اور ڈاکٹر نے آئی ٹیبلٹ ریٹ بتایا تھا۔ انہیں دواؤں کے ساتھ ساتھ انہیں اچھی خوراک کی بھی ضرورت تھی۔ پہلے ہی فرج اور کمپیوٹر خریدنے میں ساری بات لگ چکی تھی اور اب روزانہ کا خرچ اس کا ڈیونٹ تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ آپنی مزید پندرہ کی تھیں یہ تمام دن اس نے بھی بہت مصروفیت میں گزارے تھے۔ کہ فارن میسنگ کی تیاریوں میں پورے آفس میں ایک بھگدڑ سی مچی تھی، لیکن اگلے دن صبح جب وہ آفس پہنچی تو سب سے پہلے جو خبر اسے سننے کو ملی وہ اس کے حواس گم کر دینے کے لئے کافی تھی۔

”مسٹر ازم رات ایمر جنسی میں لندن فلالی کر گئے۔“

”کیا؟“ اسے ایک جھٹکا لگا تھا۔

”لیکن کیوں؟ اس طرح بنا بتائے بالکل چانک، خیریت تو ہے ناں میڈم!“ وہ ہراساں کی پوچھ رہی تھی۔

”کول ڈاؤن ریمل تمہیں کیا ہوا ہے۔“

”آں، ہا۔“ اس نے پریشانی سے سر ہٹک کر لمبی سانس لی اور خود کو کمپوز کرنے لگی۔

”وہ بہت جلدی میں تھا اس نے صرف اتنا

احساس ہی نہ ہوا تھا۔ وہ دو دن کے لئے تھے۔ سارا گھر الٹا پڑا تھا۔

مجھ ہوتے تو اتنا نہ اکثرتی ہو، کچھ تو تمہارے ساتھ ہونی چاہیے۔ ماں بننے والی ہے اور یہاں کوئی اور اماں کی یہ باتیں ان کی اضافہ کر لیں۔ انہیں دو دن کے تھے اور شاید یہ ان کے دل کی وہ تیسرے دن اپنی اماں کے لیکن جو خبر اس نے سناں تھی۔ اس کی اماں کے باہر نکلتے پر اٹھالیا یہاں تک کہ وہ ان کی ڈاکٹر کے پاس گئے۔ اس بہت زیادہ تھی۔ اسی سے

سے پاس اتنا پیسہ، جاؤ روئے تمہارا، اسے یہاں تھا ان کے علاج کے لئے تھی ہے۔“ اور پھر ان کے ان کی ساری کوشش ہے تے ہوئے بھی اگلے دن نے پر مجبور ہو گئے تھے۔

پاس کچھ پیسے ہوں گے پریس کر رہی تھی کہ ان پیسے تھیں اور بہت بنا تمہید باندھے سوال

ت۔“ ڈاکٹر سے چیک اپ س تو مناسب ہی ہے رچ بہت زیادہ ہے۔







نہیں دیا۔ پاپا کی کنڈیشن اب خطرے سے باہر ہے، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آئی سی یو سے روم میں شفٹ کیا ہے۔ وہ بہت دھیرے دھیرے اور تھکا تھکا سا بول رہا تھا۔

”اور خالہ جان کیسی ہیں۔“

وہ بہت ڈپریشن میں۔ ڈاکٹرز کے لئے یہ آپریشن کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ شاید ان کی دعائیں ہی انہیں واپس زندگی میں کھینچ لائیں ہیں۔“

”تھینک گاڈ! خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ آپ بھی ضرور نوافل ادا کیجئے گا اور پلیز اپنا بھی خیال رکھیے گا۔“ وہ بے اختیار ہی میں ہی کہہ گئی تھی اور وہ شاید مسکرا دیا تھا۔

”میں شاید ابھی دو چار دن مزید نہ آسکوں تم آنٹی کو کچھ مت بتانا۔“

”یہ جو رشتے ہوتے ہیں ناں احزم صاحب اور جن میں بات محبت کی ہو وہاں خود بخود ہی کسی ایسے کا علم ہو جاتا ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی تھی۔

”یو مین؟“ اس کے سوال پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اماں کے کہے گئے جملے اس نے اس کی گوش گزار کئے تھے۔

”تم انہیں تسلی دینا اور پلیز ریمیل اپنا کوئی کونٹیکٹ نمبر بتاؤ تاکہ ماما ان سے رابطہ کر سکیں۔ تم نہیں جانتیں کہ ایسے موقع پر ہر انسان کو کسی بہت اپنے کی ہی ضرورت ہوتی ہے تسلی کے دو بول ہی انسان کے حوصلے کو گئی گنا بڑھا دیتے ہیں۔ تم سمجھ رہی ہونا میری بات۔“

”یہ مجھ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔“ وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

”میں ٹرائی کروں گی کہ آج ہی کوئی نمبر لے لوں۔“

”ٹرائی نہیں بلکہ ضرور لینا ہے، بے شک آفس اکاؤنٹ سے پیسے نکالو الو۔“

”جانتے ہیں کتنی پریشان ہوں میں۔“

”کیوں تم کیوں پریشان ہو، تمہیں تو خوش چاہیے اور تم بھی تو آخر ایک ورکر ہی ہو۔“

”ہاں آخر میں ہوں تو ایک ورکر اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس گیا۔ تو اس نے رسیور ہنچ دیا۔ جس پریشانی میں یہ دن اس نے گزارے تھے وہ ہی جانتی تھی یا پھر کا خدا، چند لمحوں بعد ہی دوبارہ تیل ہوئی اور رسیور خان اختر صاحب کے کمرے کی طرف قدم بڑھ چکی تھی۔

”کیوں کیا ہو افون کیوں بند کر دیا۔“ لیکن

”او کے آئی ایم سوری۔“

”لیکن دیکھو اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آج کے ورک میں کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے لوگوں میں ہر انسان اپنی جگہ مجبور ہے اپنی وہ سب کچھ لیجئے بہت ایمر جیسی میں آتا ہوں اس لئے اطلاع نہ کر سکا تمہارا کوئی کونٹیکٹ نمبر بھی تو نہیں ہے میرے پاس۔“

”دراصل پاپا کو اچانک ہی بہت شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔“

”کیا ہارٹ اٹیک؟“

”ہاں رات بارہ بجے ماما کا فون آیا تو میں ایک منٹ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تم سے رابطہ ہو نہیں سکتا تھا۔ وہ تو خوش قسمتی سے فوراً ہی ہسپتال کفرم ہو گئی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو ڈاکٹرز آپریشن کفرم کر چکے تھے اور پاپا آپریشن کفرم میں تھے۔“

”اومائی گاڈ! اب کیسے ہیں وہ اور آپ نے کیا سبیل کیوں بند کر رکھا ہے میں نے ہر دوسرے منٹ ٹرائی کیا ہے لیکن بے سود۔“

”وہ نمبر یہاں تو کام نہیں آسکتا تھا اس لئے میں نمیشن اور مصروفیت میں کچھ بھی سمجھائی



”میسے ہیں میرے پاس احزم صاحب!  
انگل کو میری طرف سے پوچھئے گا اور خالہ کو بھی۔“  
اس کا دونوک سا انداز سن کر وہ خاموشی سے رابطہ  
کاٹ چکا تھا اس نے بھی آہستگی سے رسیوں رکھ

وہ دو ہفتوں کی بجائے تین ہفتے بعد واپس آیا تھا یا پاپا کی حالت اب تسلی بخش تھی کچھ دن تو ٹینشن کی ہی نذر ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ مزید کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ دو دن پہلے چونکہ وہ آنے کی اطلاع دے چکا تھا اس لئے سب ہی الرٹ ہو گئے تھے اور جنہوں نے اپنا کام کمپلیٹ نہیں کیا تھا انہیں دل کھول کر ڈانٹ سے نواز گیا تھا اور ایک وہ بھی کہ جس کی بے نیازی بدستور قائم تھی وہ جو کہ ہر روز فون کر کے اور اس کے والد کا حال دریافت کرتی رہی تھی سامنا ہونے پر ایک بار پھر اپنی انا کے خول میں بند ہو چکی تھی۔ کئی دنوں کی مسلسل مشقت نے اسے تھکا دیا تھا اس لئے اب وہ اپنی سیٹ کی پشت پر سر رکھے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ ٹھکن اور الجھن کے آثار اس کے چہرے پر بہت واضح تھے۔ دروازے پر دستک کی آواز پر بھی اس کی پوریشن بدستور تھی۔ ”آ جاؤ۔“ کی آواز پر وہ دروازے کو ہلکا سا

پیش کرتی اندر چلی آئی وہ اپنے مخصوص نامہ  
بیٹھا تھا۔

”کل جو فائلز آپ نے مجھے دی تھیں تمام کپیٹ ہو چکی ہیں اور کمپیوٹر پر تمام بنا کر انہیں بھی تیار کر لیا ہے۔ اب آپ چیک کر لیں پلیز۔“ وہ بخجیدگی سے ہاتھ ہاتھ لگائے اس پر نظریں جماتے ہوئے تھا جو مسلسل بول رہی تھی۔ اس کی خاموشی کو سر کے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں لاشی واضح تحریر پڑھ کر دانتوں تلے دبا کر خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد بھی جب اس کا انداز بدستور رہا تو اسے بھرپور لہرایا۔

”مسرز احترم حسن ان بے جان فائلوں سے زیادہ اہم زندگی کی فائل ہے جسے آپ شاید کبھی بھی کھولنا نہیں چاہتیں۔“ وہ چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

ایک دم گھبرا گئی تھی اس کا انداز ہمیشہ سے مختلف تھا۔ اس نے اس کے اٹھتے قدم روک کر بازو سے پکڑ کر کرسی پر دھکیل دیا۔ آج اس پر بچانے کیسے جذبات حاوی ہوئے تھے کہ وہ اپنے اندر ایک طوفان اٹھتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحے خاموش رہ کر خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کھڑکی کے پاس پہنچ کر بہت گہری سانس لی تھی۔



ضرورت ہے اور نہ ہی میں جانتی ہوں کہ آپ مجھ پر ترس کھا میں۔ لہذا آپ کو جو بھی فیصلہ کرنا ہے پلیز جلد از جلد کیجئے۔ وہ آہستہ آہستہ اور ایک ایک لفظ پر غور کر رہی تھی۔ اس کے ہوش کم کر رہی تھی وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کے متعلق ایسا سوچتی ہے۔

”میری اماں کی اموشن بلیک میلنگ کی زد میں آ کر جو کچھ بھی ہوا اس میں میں آپ کو تصور وار نہیں سمجھاتی اور اب کسی بھی فیصلے کے نتیجے میں آپ کو مورد الزام ٹھہرانے کے حقدار نہیں ہیں ہم۔ آپ ہر طرح کے فیصلے میں با اختیار ہیں اور اگر آپ چاہیں تو ابھی اور اسی وقت اپنے اس حق کو استعمال کر سکتے ہیں آپ۔“ وہ اس کے ہونٹوں سے برآمد ہونے والے تین الفاظ کو سننے کے لئے خود کو مضبوط ظاہر کرتی اس کے سامنے آ کر چند قدم پر رک گئی۔ وہ بہت سنجیدگی سے سوچتی ہوئی کیفیت میں اسے دیکھتا رہا اور پھر اچانک ہی اس کی آنکھوں میں شرارت سی گئی اور ہونٹوں کے کونے مسکرائے۔ اس نے دو قدم بڑھا کر اپنے اور اس کے درمیان کا فاصلہ کم کیا۔

”سوچ لو، تم مجھے فیصلے کا اختیار بھی دے رہی ہو اور ابھی اور اسی وقت اس حق کو استعمال کرنے کی اجازت بھی۔“ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل آویز اور معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کی بات اور انداز کا مطلب سمجھ کر گڑبڑا کر نورانی پیچھے ہٹی تھی اور اپنے بلش ہوتے چہرے کو چھپانے کے لئے پٹی اور پھر اس کی کرسی کے پیچھے سے ہوتی ہوئی بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی کہ اب وہ اس کے قریب سے گزرنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ باہر قدم رکھنے سے پہلے اس کا قہقہہ سماعت سے ٹکرایا تھا۔ اس نے پوری قوت سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر اس نے پہلے چہرے پر آئے پسینے کو صاف کیا اور دھڑکنوں کو

”پلیز ریمیل تمہارا رویہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“ اس کے لہجے سے بے بسی چٹکی تھی۔ ہالوں پر کمر رہی ہو تم میرے ساتھ اس طرح، پلیز پلیز ہیلپ می، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے تمہارے سامنے۔“ اسی دم فون کی گھنٹی بہت زور سے بجی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ فون کی طرف دیکھا تھا۔ وہ چونک کر کھڑی ہوئی۔ وہ چونکہ دور کھڑا تھا اس لئے اس کی نگاہوں کے حکم پر ریسیور اٹھالیا۔ لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی کوئی بہت بے چینی سے بولا تھا اور یہ آواز اسے جیسے ہوش کی دنیا میں پہنچ لائی تھی۔ اس نے ماذتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ریسیور اس کی طرف بڑھایا۔

”زندگی کی اصل حقیقتوں سے ”فرار“ نا تو آپ ہی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی میں ”مس رضیہ جنید“ بہت بے چین ہیں آپ کے لئے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی بولی تھی وہ بھی ایک ایک قدم جھٹکتا ہوا عین اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اس سے ریسیور لے کر اس ڈس کنیکٹ کر دی اور ریسیور ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔

”اب بولو۔“ وہ اس کی نگاہوں میں دیکھتا ہوا بولا تو وہ اس کے انداز پر رخ موڑ گئی۔ ”میں اس حقیقت سے بہت اچھی طرح آگاہ ہوں کہ جو کچھ بھی ہوا وہ وقتی اور حالات و جذبات کی رو میں بہہ کر کیا جانے والا ایک بہت غلط فیصلہ تھا۔“ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس سے دور ہو گئی۔

”اور میں یہ اچھی طرح سے جانتی ہوں سر کے آپ ایک بہت نرم دل اور احساس طبیعت کے مالک ہیں آپ کسی بھی غریب اور مجبور انسان سے ہمدردی کرنا اور اس کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ حقیر اور بے بس لوگوں پر بہت ترس آتا ہے آپ کو۔“ وہ رکی۔

”لیکن مجھے نہ تو آپ کی ہمدردی کی

فل جوڈا کو متنس آپ نے مجھے دی چکی ہیں اور کمپیوٹر پر تیار کر لیا ہے۔ اب آپ نے وہ سنجیدگی سے پر نظریں جماتے ہوئے اس کی خاموشی کی طرف دیکھا لیکن اس کی خاموشی وہ بھی واضح تحریر پر خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں کا انداز بدستور ہوا

”یہ فائل.....“  
”فائل میں۔“ اس نے

حسن ان بے جاں کی فائل ہے جسے آپ چاہتیں۔“ وہ چلا

ایسی باتوں کا نہیں بہت کام ہے اس کا انداز ہمیشہ سے اٹھتے قدم روک دیا۔ آج اس نے تھے کہ وہ اسے سوس کر رہا تھا۔ کرنے کی کوشش بہت گہری سانس



معمول پر لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اپنے سین میں قدم رکھا صد شکر کہ مسز خان راؤنڈ پر تھیں۔ کیونکہ وہ جب بھی اس کے کمرے سے آتی مسز خان بہت کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی تھیں لیکن ہمیشہ ہی وہ اس کے چہرے پر کوئی بھی خوبصورت سے رنگ تلاش کرنے میں ناکام رہتی تھیں اور آج وہ یہ موقع گنوا چکی تھیں۔

رضیہ چند کے ساتھ اس کی اچھی خاصی جھڑپ ہوئی تھی کہ وہ اسے ٹائم نہیں دے رہا۔ ”تم میرے برابر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو روز، پکیز تم اگر انہیں سولو کرنے میں میرا ساتھ نہیں دے سکتی تو ان میں اضافہ کرنے کی کوشش مت کرو، ہر میننگ کے دوران تمہارا فون یا تم خود فیک بڑتی ہو، تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کیا سوچتے ہوں گے سب لوگ تمہارے متعلق۔“

”مائی فٹ، جو چاہے مرضی سوچتے رہیں لیکن تم نے اگر میرے ساتھ اپنا رویہ ٹھیک نہ کیا تو میں انکل سے تمہاری شکایت کروں گی انڈر سٹینڈ۔“ اس نے انگلی اٹھا کر اسے وارن کیا۔

”فار گارڈ سیک، روز! تمہیں معلوم ہے کہ وہ ابھی ایسی کنڈیشن میں نہیں ہیں کہ انہیں کوئی بھی ٹینشن دی جائے۔“

”آئی ڈونٹ کیئر، دس ازناٹ مائی پرابلم۔“ وہ اس کی بے حسی پر کڑھ کر رہ گیا۔

”گیٹ آؤٹ، گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔“ اس نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں دھیمی آواز میں کہا۔ وہ ایک قہر آلود نظر اس پر ڈال کر پاؤں چپتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔ کتنے ہی لمحے لگے تھے اسے خود کو کمپوز کرنے میں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو ایک میننگ کال کی تھی اس نے لیکن اب وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ کسی بھی معاملے میں بحث و تکرار کر سکے اس لئے ڈھیر فائلیں اٹھائے آتے ہوئے عبدل کو دیکھ کر اس نے

میننگ کینسل کرنے کا آرڈر دے دیا تو وہ بھی سر ہلاتا چلا گیا اسی وقت دروازہ کھول کر مسز خان اندر آئیں تھیں اور اسے اس کی مخصوص پوزیشن میں بیٹھے دیکھ کر اس کی ذہنی تھکن کو بھانپ گئیں تھیں اس لئے خاموشی سے اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ چند لمحے گزرنے کے باوجود بھی وہ اسی انداز میں بیٹھا رہا تو انہیں بولنا پڑا۔

”کیا بات ہے آج پھر ڈپر سید ہو۔“ اس کے گزشتہ دو چار روز کے بہت اچھے اور خوشگوار موڈ نے آفس کے ماحول پر بھی اچھا اثر ڈالا تھا وہ بھی خوش تھیں لیکن ریبیل کی طرف سے پریشان کہ وہ چار دنوں سے آفس نہیں آئی تھی۔

”احزم ایک بات میں تم سے ضرور کہوں گی کہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے فیصلے کا اختیار تمہیں اپنے فادر کو نہیں دینا چاہیے یہ حق تمہیں اپنے پاس محفوظ رکھنا چاہیے تھا۔“ وہ اس کی پرابلم کو سمجھ رہی تھیں، ان کی بات پر وہ خاموش رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

”ریبیل نہیں آ رہی تھی دنوں سے۔“ وہ پھر گویا ہوئیں تھیں۔

”اس نے آفس کا بہت سا بوجھ اٹھا رکھا ہے اپنے کندھوں پر کوئی بھی ریسپونسیبلی نہ ہونے کے باوجود اس نے بہت ہارڈ ورک کیا ہے۔ میری اور تمہاری بہت سی ذمہ داریاں اس نے سنبھال رکھی ہیں اس کی موجودگی میں کوئی فکر نہیں ہوتی مجھے لیکن جس دن سے وہ نہیں آ رہی ایسا لگتا ہے سارے آفس کا کام میرے کندھوں پر آ گیا ہے۔ ویسے اپنی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے یہ اچھی پالیسی ہے اس کی۔“

”بہت دلا دیا اس انہیں اہمیت کا احساس، فوراً کال کریں اسے کہ اس کی چھٹی کینسل کر دی گئی ہے۔“ اس نے ایک دم ہی سیدھے ہو کر آڈر کیا تھا وہ اس کے اس انداز پر مسکرا دی اور واقعی اس حقیقت کو تو وہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ وہ سینہ







کو توڑا اور ایک دفعہ پھر دروازہ کھول کر اندر غائب ہو گئی تھی۔  
وہ حیرتوں کا جہان چہرے پر سجائے بت بنا بند دروازے کو دیکھ رہا تھا شاید وہ خود بھی ابھی تک ساری صورتحال کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ ابھی ابھی مہمانوں کو میننگ روم میں چھوڑ کر خود اس کو مزید بریفنگ دینے کے لئے ادھر آیا تو شوخ کپڑوں میں ملبوس دروازے پر جھکی لڑکی کو پہچان نہیں پایا تھا۔ جیسے ہی اس کے قدم ر کے تھے وہ پلٹی تھی اور اسے ایک خوبصورت حادثے کے گزر جانے کا احساس بہت دیر بعد ہوا تھا۔ وہ نامعلوم سی فیلنگوں لئے واپس پلٹ گیا۔

عبدال اسے دوبارہ بلانے آیا تھا لیکن اس کے سامنے کے خیال سے ہی اس کا ننھا سادل لرز اٹھتا تھا۔ اس کو رہ کر خود پر غصہ آیا تھا۔  
”کیا آج ہی یہ سب کچھ ہونا تھا؟“ وہ ٹہل ٹہل کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔  
”ریمل واٹ از پرابلم یار، پلینز کم آن ٹو میننگ روم۔“ مسرز خان حواس باختہ سی آئی تھی۔  
”جج..... جی میڈم! میں بس آ ہی رہی تھی۔“

میننگ توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہی تھی اس نے تمام وقت ہر ممکن اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ کنفیوز ہونے کے باوجود جب پولنے پر آئی تو بہت خوبصورتی سے لمبائی کو درپیش مسائل اور ایک ایک پوائنٹ کو واضح کرتی چلی گئی۔ پروجیکٹر پر یکے بعد دیگرے چلنے والی تمام سلائیڈز اس نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی تھیں۔ اس لئے اس میں کسی بھول چوک کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سب نے ہی اس کے انداز کو بہت سراہا تھا۔

اتنی بڑی کامیابی کی خوشی میں احزم نے ایک بہت بڑی پارٹی ارنج کی جس میں اس نے

تمام ورکرز کی تنخواہوں میں اضافے اور ضرورت کی جانے والی ترقیوں کو ادا کیا لیکن نہ تو اس نے اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا ہی اسے ترقی کا کوئی مشورہ سنایا۔ اسے مسرت آیا لیکن خاموش رہی۔ سینئرز نے بھی تنخواہ نہیں دیا تھا جس کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور پھر مسرز کے ”جی ایم“ بننے کے بعد خود بخود ہی اس سیٹ کا تعین ہو گیا تھا، لیکن ایم ڈی کی اس بن جانے کو باقاعدہ انوائس نہ کیا گیا تھا۔  
اور اب وہ جب بھی اس کے کمر سے جاتی بظاہر تو اس کا انداز بہت پروفیشنل ہوتا تھا آنکھوں میں ناچتی شرارت اور ہونٹوں سے مسکراہٹ اسے زچ کرنے کے لئے کافی ہوتی تھی۔ ہر بات کو ذومعنی انداز میں کرنے کا عادی تھا۔ اس کا یہ انداز اسے زچ کر رہا تھا۔ اس نے ایک ممکن حد تک اپنی سوچوں اور محسوسات کو دیکھ کر کیا تھا۔ باقاعدہ حکم نامہ ملنے پر ہی وہ کمرے سے نکل کر آئی تھی۔  
اس کی سلیپر جو نئی لڑکی آئی تھی وہ خاصا ماڈرن اور ایڈوانس تھی اور اسے ایم ڈی صاحب کے آفس میں بھاگ بھاگ کر جانے بہت شوق تھا اور اس نے اس بات کا بالکل کوئی نوٹس نہیں لیا تھا کہ ہر روز جدید تر اس کے نئے لباس پہن کر آنے والی تھی۔  
اپنے ایم ڈی صاحب کی بے نیازی کا گلہ کرتی رہتی تھی۔ بلکہ اس کی سرد آہیں تو باقاعدہ فریاد کرنے لگیں تھیں اور اب بھی وہ اس کے کمرے سے آئی تھی۔

”آہ، میڈم! ایک بات کو بتائیں اتنا عمر ہو گیا ہے آپ کو ان صاحب کے ساتھ کام کرنے کیا آپ پورے یقین سے کہہ سکتیں ہیں کہ انگریز کے تعلیم یافتہ ہیں مجھے تو لگتا ہے مغربی ممالک کی ہوا بھی انہیں چھو کر نہیں گزری۔ اس کی میم زیادہ خوبصورت ہے مجھ سے۔“



”سے آئی کم ان سرا“ اس نے اک ادا سے کہا تو اس نے ایک تنقیدی نظر اس کے سراپے پر ڈالی، اس کا جسم نمایاں کرتا لباس اسے ہمیشہ ہی اشتعال میں مبتلا کرتا تھا اس وقت بھی اس نے اسے دیکھ کر لب بھینچ لئے۔

”سرا! پلیز یہ فائل چیک کر کے سائن کر دیں۔“ وہ اس کے دائیں سائڈ پر بالکل قریب کھڑی فائل رکھتے ہوئے خود بھی جھنجھی تھی۔ اس کا بازو اس کے کندھے سے گرایا تھا تا کواری کے باوجود وہ خاموشی سے سائن کرنے لگا لیکن اس کے کچھ بتانے پر جسے ہی اس نے اس کی طرف دیکھا تو بالکل غیر ارادی طور پر اس کے جھکے ہونے کے باعث اس کے حد سے زیادہ کھلے گریبان میں جہاں تک اس کی نظری تھی وہ اسے بھڑکا دینے کے لئے کافی تھی اپنے سامنے دھکیلی فائل اٹھا کر پورے غصے سے سامنے پھینکی تھی اور تمام کاغذات اڑ کر سارے کمرے میں پھیل گئے تھے۔ فوراً ہی انٹرکام رسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”میرے کمرے میں آؤ فوراً“ وہ دھاڑا تھا۔ زارا حیران اور سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اس کی سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا۔ اس کی دھاڑ پر وہ پہلے ہی پریشان ہو گئی لیکن کمرے میں قدم رکھتے ہی گھبرا گئیں وہ دنگنا ہوا اس کے سر پر پہنچا تھا۔

”کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں میرے ساتھ کام کرتے ہوئے۔“

(باقی اگلے ماہ)

”زارا ڈونٹ بھی سلی۔ ایم ڈی صاحب کو بچے کام پر توجہ دینے والے لوگ زیادہ پسند ہیں۔“

”تو پھر آپ کو پسند کیوں نہیں کر لیا آپ تک نہیں نے۔“ وہ مسکرا کر بڑی ادا سے بولی تھی۔

”شٹ اپ، پلیز ٹیک یور سیٹ۔“ وہ خاموشی پر بھی سے بولی تھی۔

اب زندگی کچھ روٹین سے گزرنے لگی تھی وہ شام پانچ بجے گھر پہنچ جاتی تھی۔ اس نے ایک دو دفعہ باپ کا پتہ کرانے کی کوشش کی تھی لیکن ان کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ گرمیوں کا موسم آہستہ آہستہ اپنے اختتام کی جانب گامزن تھا۔ بارشوں کا ایک طویل سلسلہ جاری تھا۔ دن بہت عجیب اور بوجھل ہو گئے تھے کہ آپنی ایک نئی زندگی کی نوید لے کر آئیں تھیں نقاہت اور کمزوری کے باوجود خوشی اور حیا کے ملے جلے تاثرات نے ان کے چہرے کو انوکھا نکھار بخشا تھا۔

”کیا بات ہے آپنی بڑی خوش نظر آ رہی ہیں۔“ اس کے پوچھنے پر انہوں نے اپنی پازٹیو رپورٹ اس کے سامنے کر دی تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ وہ دونوں کلینک سے ادھر ہی آئے تھے اماں نے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ مٹھائی، فروٹ اور دو ہزار روپے بھی ساتھ دیئے تھے تاکہ وہ اپنی خوراک کا خاص خیال رکھے۔

پھر تو ایک نیا مشغلہ تھا جو کہ ان کے ہاتھ لگ گیا تھا اماں سارا سارا دن نئے آنے والے مہمان کی آمد کی تیاریوں میں لگی رہتی اور وہ جب ہی بازار جاتی کوئی نہ کوئی کھلونا یا کپڑا خرید لاتی۔

”زارا! تم یہ فائل ایم ڈی صاحب کے پاس لے جاؤ۔“ اس نے اچھی طرح چیک کرنے کے بعد فائل کو بند کرتے ہوئے اس کے حوالے کی اور وہ تو جیسے غصہ منظر رہتی تھی چڑیا کی طرح اڑ کر اس کے کمرے میں پہنچی تھی۔

ت کی جانے والی ترقیوں کو انہوں نے اس نے اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔ اس کا کوئی مزید سنا۔ اسے سیکرٹری نے بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور پھر اس نے اپنے بچے کے بعد خود بخود ہی ان ہو گیا تھا، لیکن ایم ڈی کی دبا قاعدہ انوائس نہ کیا گیا تھا۔ وہ جب بھی اس کے پاس اس کا انداز بہت پروفیشنل ناچتی شرارت اور ہونٹوں سے زچ کرنے کے لئے کافی معنی انداز میں کرنے کا انداز اسے زچ کر رہا تھا۔ ممکن حد تک اپنی سوچوں اور باقاعدہ حکم نامہ ملنے پر۔

سیلر جو نئی لڑکی آئی تھی وہ ریڈوائس بھی اور اسے اس میں بھاگ بھاگ کر اس نے اس بات کا کیا یا تھا کہ ہر روز جدید تر اس پہن کر آنے والی تھی۔ اس کی بے نیازی کا بلکہ اس کی سرد آہیں نے لگیں تھیں اور اب اس کی تھی۔

ایک بات کو بتائیں ان صاحب کے ساتھ کا یقین سے کہہ سکتیں ہوتے ہیں مجھے تو لگتا ہے انہیں چھو کر نہیں



MARCH 2008

Skorpio  
FriendsKorner





مکمل ناول

تیری قسط

last epi

مجھے اپنے ملے کا فرود دو

شاہنشاہ

Skorpio  
FriendsKorner



”تت..... تین سال سرا“  
 ”تو کیا ان تین سالوں میں اب تک تم  
 میرے مزاج سے واقف نہیں ہو سکیں۔“ اس کی  
 آنکھوں سے شعلے اور زبان سے انگارے برس  
 رہے تھے۔

”جی!“ وہ اس کی بات نہ سمجھے پائی تھی کہ  
 اصل صورتحال سے وہ بالکل ناواقف تھی۔  
 ”کس نے اپناٹ کیا تھا اس لڑکی کو یہاں۔“  
 ”وہ مم..... مسز خان نے سرا“ وہ اسے  
 گھورتا ہوا واپس اپنی ٹیبل کے پاس گیا اس کی  
 سائیڈ پر لگے بین کو پریس کیا۔ باہر کھٹی کی آواز  
 سنتے ہی عبدال بوتل کے جن کی طرح کمرے میں  
 داخل ہوا تھا۔ جب کہ وہ ایک کاغذ پر کچھ لکھنے  
 میں مصروف تھا۔

”یہ لیٹر رفیق صاحب سے فوراً ٹائپ کروا  
 کر لاؤ۔“ گھبرائے ہوئے عبدال نے فوراً کاغذ  
 تھاما اور نکل گیا اور اب وہ دیوار کے ساتھ لگی مس  
 زار کی طرف بڑھا تھا۔

”مس زار یاد رکھیے گا کہ عورت کا لباس  
 اور اس کا انداز ہی اس کے وقار اور عزت کی نشانی  
 ہوتی ہے اور اس کی عزت کو پناہ ہمیشہ اس کی چادر  
 دیتی ہے اور اگر چادر ہی اس کے جسم سے غائب  
 ہو جائے تو کوئی اس کی عزت نہیں کرتا سمجھیں  
 آپ اور اب آپ جاسکتیں ہیں اور آئندہ یہاں  
 آنے کی زحمت مت کیجئے گا۔“ وہ آنکھوں میں  
 آنسو لیے فوراً وہاں سے نکل گئی اور اس کے  
 جانے کے بعد وہ ریمیل کی طرف آیا تھا۔

”کیا چاہتی ہو تم؟“ اس کا لہجہ بہت سرد اور  
 پھنکارنا ہوا تھا۔

”میرے کردار کو آزمانا چاہتی ہو۔“  
 ”تو تمہاری اطلاع کے لئے بتا دوں اتنا  
 کمزور نفس نہیں ہے میرا، اگر ایسا ہی ہوتا تو بہت  
 سی راہیں ملتی تھیں میرے لئے کوئی نہیں روک سکتا  
 تھا مجھے اور تم جو یہاں.....“

”جاؤ چلی جاؤ یہاں سے۔“ وہ جو اس کی  
 جھکی لرزنی پلکوں پر نظریں جمائے سخت لہجے میں  
 بول رہا تھا اس سے پہلے کہ جذبات کی رو میں بہہ  
 کر کچھ کہہ بیٹھتا فوراً اس پر سے نظریں ہٹا کر پلٹتے  
 ہوئے چینا تھا۔ اس نے پلکیں اٹھا کر اس کی پشت  
 کو دیکھا اور اس کی پچھتی ہوئی مٹھیوں کو دیکھ کر اس  
 کے اندر کے بیجان کا اندازہ لگاتے ہوئے  
 خاموشی سے نکل آئی۔ اس سب کے باوجود بھی  
 نجانے کیوں ایک طمانیت اور ایک تفاخر کا احساس  
 اس کے اندر دور تک پھیل گیا تھا۔ ہونٹوں کی  
 تراش میں ایک خوبصورت مسکراہٹ سج گئی تھی۔  
 ”خیریت تو ہے محترمہ، سنا ہے تمہاری سیٹ  
 شیئر کرنے والی لڑکی کو نکال دیا صاحب نے۔“  
 مسز خان کی مسکرائی آواز پر وہ چونک کر سیدھی  
 ہوئی تھی۔

”جی ہاں صحیح سنا ہے آپ نے۔“

”مجھے تو فوراً حاضری کا بہت سخت آؤر  
 موصول ہوا۔“  
 ”دھیان سے جائیے گا بہت سخت غصے میں  
 ہیں سرا!“

”وہ غصے میں ہیں تو آپ کے چہرے پر یہ  
 قوس قزح کیوں بکھری ہے۔“ ان کی بات پر وہ  
 کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھتی رہ گئیں۔

”کتنا بڑا خزانہ چھپا رکھا تم نے اسے پاس  
 اپنی اس خوبصورت ہنسی کا، کبھی یہ خزانہ اگر اس  
 آہن دل پر بھی نچھاور کرو تو تمام قفل لمحوں میں  
 کھل جائیں۔“

”میری فکر چھوڑیے میڈم! اور جائیے ایسا  
 نہ ہو کہ شعلوں کی لپیٹ میں آپ بھی آجائیں۔“  
 ”او کے میڈم لئے دعا کرنا۔“ ان کی  
 بات پر وہ پھر ہنسی تھی۔

”گلتا ہے اس کمرے کی مکمل اجاراداری پر  
 کچھ زیادہ ہی خوش ہو، ہاں بھی تمہارے لئے تو یہ  
 بڑے نصیب کی بات ہے۔“ وہ جاتے جاتے بھی



دل کے تاروں کو چھیڑنے سے باز نہ  
رہیں تھیں۔

ایسی حقیقتیں تھیں جن سے وہ پہلی بار روشناس ہو  
رہی تھی وہ سبکدستی بھی ایک ہی نقطے پر نظر نہیں  
جمائے ہوئے تھی۔

بیشک بہت واضح لفظوں میں اس نے اسے  
کبھی کوئی امید نہ دلائی تھی، لیکن اس کا رویہ اسے  
بہت کچھ باور کراتا تھا۔ جسے وہ سمجھتے ہوئے بھی نہ  
تھی، لیکن ان سب باتوں کا تو اسے بھی وہم و  
گمان بھی نہ گزرتا تھا۔

”اور پھر حسن بھائی تو ہیں بھی دل کے  
مریض نجانے یہ خبر ان کی زندگیوں میں کون سی  
قیامت ڈھائے۔“ اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر  
اماں کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں خاموش کروا  
دے۔

”میں تو ڈرتی ہوں اس وقت سے کہ نجانے  
میری ہسروں جیسی اور جنت کی حوروں جیسی پارسا  
بہی پر کوئی الزام نہ لگ جائے۔“  
”وہ اتنی دور بیٹھے کیا جانیں کہ ان کی غیر  
موجودگی میں یہاں کیا ہوا۔“ اب ان کے آسمو  
سلسل بہنے لگے تھے۔ جنہیں انہوں نے نورانی  
پونچھ دیا۔

”بس میں آج ہی جاؤں گی اس کے پاس  
تاکہ وہ جلد از جلد فیصلہ کر دے، تاکہ ان کے  
آنے سے پہلے پہلے میں کہیں تیری بات نہ  
کر کے شادی کی تاریخ طے کر دوں۔“ وہ آنکھیں  
پھاڑے ان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سانس شاید  
کہیں سینے میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی اور پھر وہ  
ایک جھٹکے سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔ تو اماں بھی  
اسی وقت چادر سنبھالتی باہر نکل گئیں۔

خالہ کی اچانک اور غیر متوقع آمد پر وہ بھی  
حیران تھا۔ انہوں نے ڈنر کے بعد اس سے کسی  
ضروری بات کرنے کا کہا تو وہ انہیں اپنے بیڈروم  
میں لے آیا اور جب انہوں نے اپنے خیالات

وہ آج اماں سے بڑے موڈ میں باتیں کر  
رہی تھی اور اپنی کی ہوئی شاپنگ انہیں دکھا رہی تھی  
لیکن وہ غصے سے تو جی کو ٹوٹ گیا تھا۔

”کیا بات ہے اماں کچھ پریشان ہیں؟“  
اس کے پوچھنے پر انہوں نے بہت گہری اور طویل  
سانس لی تھی۔

”اچھا کب، یہ خوشی کی بات ہے، آپ اتنا  
پریشان کیوں ہیں۔“ اس کی بات پر انہوں نے  
اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں کہ  
”کیا تو نہیں جانتی“ لیکن وہ ان کی نظروں کا  
مطلب نہ سمجھتی تھی۔

”سات مہینے ہو گئے نکاح ہوئے لیکن  
”م نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا۔“ وہ بہت  
پریشان لہجے میں آہستہ آہستہ بولنے لگیں۔

”برسوں بعد جو بہن ترس ترس کر مجھے ملی  
ہے اس کے سامنے اب کون سا منہ لے کر جاؤں  
گی، کیا سوچے گی وہ ہمارے بارے میں، اگر،  
اگر اسے کچھ پتہ چل گیا وہ تو شاید جیتے جی میرا  
نہ بھی دیکھنا گوارا نہ کرے۔“

”اور حسن بھائی، ان کا کیا رد عمل ہوگا، وہ تو  
میں کہیں گے کہ ہماری غیر موجودگی میں ہمارے  
بچے پر قبضہ جما لیا، نجانے کون کون سے  
جھگڑے استعمال کر کے اسے قابو میں کر لیا۔ ان  
کی تو کل کائنات ہی ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس پر  
بھی ڈاکہ ڈال دی۔ میری بہن کی زندگی تو اجیرن  
ہو جائے گی۔ اس کا گھر سے جانا تو اس کے لئے  
طعنہ نہیں بنا لیکن یہ بات اس کے لئے ہمیشہ کے  
لئے داغ بن جائے گی۔“ ان کی مدھم آواز اسے  
حقیقتوں کے جہان میں دھکیل رہی تھی اور یہ



سے پردہ ہٹایا تو وہ دم بخود نہیں دیکھتا رہ گیا۔ وہ تو بھی تصور ہی نہ کر سکتا تھا کہ وہ ایسا سب کچھ سوچتی ہیں اپنی گواہ افشائیاں نئی حقیقتوں کے راز واکر رہی تھیں۔

”اس لئے بیٹا میں چاہتی ہوں کہ میری پاک دامن بیٹی کے دامن پر کوئی بھی دھبہ لگنے سے پہلے تم کوئی فیصلہ کر لو۔ میں نہیں چاہتی کہ ان کے کانوں میں کوئی جھنک بھی پڑے تمہاری اور ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ان کے آنے سے پہلے اس معاملے کو سیٹ لیا جائے۔“ انہوں نے اپنی بات کہہ کر جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ لب بلیج کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”اچھا میں اب چلتی ہوں میری باتوں پر غور کرنا۔“ وہ اس سارے وقت میں ایک لفظ بھی نہ بول پایا تھا سوا اب بھی خاموش ہی رہا تو وہ پھر گویا ہوئیں۔

”میں اب جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتی ہوں۔ رشتے کرانے والی ماسی آج کل میرے پیچھے بڑی ہے۔ دو تین اچھے رشتے ہیں اس کے پاس، لیکن تم کوئی فیصلہ کرو تو میں آگے کچھ سوچوں۔“ وہ اس کی طبیعت سے بے خبر بولتی جا رہی تھیں اور وہ انہیں دیکھتا رہ گیا۔

وہ جا چکی تھیں لیکن اس پر سوچوں کے نئے دروازے کھلیں تھیں۔

وہ جو ساری رات ایک بل بھی نہ سو پائی تھی۔ صبح ایک مصمم ارادہ پلے کر گھر سے نکلی تھی وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن اپنے دامن پر الزام کا کوئی دھبہ اسے گوارا نہ تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ آج ہی اس سے بات کر کے اس قصے کو ختم کر دے گی۔ لیکن نہ تو سارا دن اس نے اسے آفس میں طلب کیا اور نہ ہی وہ خود اندر جانے کی ہمت کر سکی، بلکہ اس کے برعکس آنے والے دنوں میں بہت پریشانی اور دو ٹوک سا

انداز ہو گیا تھا اس کا وہ اسے نظر انداز کئے بہت سنجیدگی سے بات کرتا تھا اور وہ اس سے بات کرنے کا سرا تلاش کرتی باہر آ جاتی، لیکن آج وہ اپنا سارا کام نمٹائے جانے کے بعد بھی متذبذب سے کھڑی رہی۔

”کیا بات ہے اس طرح کیوں کھڑی ہیں اب آپ، جائیے اپنی سیٹ پر۔“

”سر! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“

اس کے فیصلہ کن انداز کو دیکھ کر وہ فوراً ہی اپنا ریوالونگ چیئر کو گھسیٹ کر اس کی طرف پشت کئے کمپیوٹر میں مصروف ہو گیا۔

”آئی ایم سوری میں اس وقت آفس ورک سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کر سکتا آپ سے جا سکتی ہیں آپ۔“

”لیکن۔“

”میں نے کہا نا جا سکتیں ہیں آپ۔“ وہ بالکل اجنبی بنا بیٹھا تھا۔

اور پھر چند ہی دنوں بعد اس کی سیٹ چھین کر دی گئی۔ وہ ایک بار پھر منزل میں مسز خان کی اسٹنٹ بنادی گئی تھی۔

اب اس کا رابطہ اس کے ساتھ ختم ہو گیا تھا اور دنوں ان کا آتنا سامنا نہ ہوتا تھا جب کہ آفس میں مس رضیہ جنید کی آمد و رفت ایک بار بڑھ چکی تھی۔ وہ مسز خان ہی کے آفس میں گلاس ونڈو کے پاس رہی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھی پنچ ٹائیم میں ان دنوں کے جانے کا منظر روزانہ دیکھتی تھی۔ آج بھی وہ بالکل غیر ارادی طور پر پارکنگ میں کھڑی اس گاڑی کو دیکھ رہی تھی جب وہ دونوں آفس کی عمارت سے نکلے رضیہ نے بڑی بے تکلفی سے اس یک بازو کو پکڑ رکھا تھا اور لہرائی بل کھائی اس کے ساتھ چلی آ رہی تھی گاڑی بہت آہستگی سے پارکنگ سے نکلی اور گاڑیوں کے سمندر میں گم ہو گئی لیکن وہ ابھی تک وہیں نظر میں جمائے بیٹھی تھی۔



”ریمل بس کرو وہ لوگ جا چکے ہیں۔“  
سرز خان کے کہنے پر وہ بہت بری طرح چونکی  
”جج..... جی میڈم میں تو۔“  
”آؤ لنگ ٹائم ہو گیا ہے۔“ انہوں نے اس کا

ہاتھ تھاما۔  
”مجھے بھوک نہیں ہے میڈم۔“ اس نے  
نظریں جھکا لیں تو اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔  
”تم یہ منظر روزانہ دیکھتی ہو، اب تک تو  
نہیں عادی ہو جانا چاہیے تھاریمل۔“  
”نہیں میڈم میں تو وہ.....“

”ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم انہیں نہیں دیکھ  
رہی تھیں، اپنے دل میں جھانک رہی تھیں۔“  
”کب تک تم دونوں ایک دوسرے سے  
بھاگتے رہو گے ریمل! میں نے تم سے کہا تھا ناں  
کہ میں احزم کو بہت قریب سے جانتی ہوں۔ وہ  
بھی کسی میں انوال نہیں ہوا یہاں تک کہ میں  
پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ رضیہ جنید میں  
ججی نہیں اور ایسا مرد جب کہیں انوال ہوتا ہے کسی  
سے محبت کرتا ہے تو بہت ٹوٹ کر چاہتا ہے  
اسے۔“

”میڈم پلیز بس کریں۔“ وہ اپنے دل کی  
منتشر ہوئی دھڑکنوں کو قابو کرنے کی ناکام کوشش  
کرتی اٹھ گئی۔

”آپ یہ سب اتنے دعوے سے کیسے کہہ  
سکتیں ہیں، محض مفروضوں پر زندگی نہیں گزرتی  
میڈم اور میں خواب بھی نہیں دیکھتی اور پلیز آئندہ  
آپ اس ٹاپک پر بھی بات نہیں کریں گی۔“ وہ  
آج کل اس کی حد سے بڑھتی ہوئی لالچ اور بے  
اعتنائی کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی خواب سجانا نہیں  
چاہتی تھی تقریباً دو مہینے ہو گئے تھے اسے اس سے  
بات کرنا تو کچھ اگر کہیں اتفاقاً ان کا آمنا سامنا ہو  
جی جاتا تو وہ مکمل طور پر اسے نظر انداز کرتا ہوا چلا  
جاتا یا پھر اگر وہ کبھی اسے سلام کرتی تو محض سر کی

جنبش سے جواب دیتا تھا۔ رضیہ جنید پر اس کی  
برہوتی ہوئی عنایات اب کوئی ڈھکی چھپی نہ تھی اور  
پھر وہ تو اس کی منگیتر تھی جس کا اعلان اس نے  
بڑے فخر سے ڈنکے کی چوٹ پر کیا تھا۔ لیکن اس  
کے پاس فخر کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ محض  
کاغذ کا ایک ٹکڑا کہ جسے اس نے اس کی ماں کی  
چادر کی لاج رکھتے ہوئے اس کے حوالے کیا تھا۔  
وہ آنکھوں میں آنی می کو صاف کرتی باہر نکل گئی۔

”احزم دیکھو مجھے راشدہ کے ہاں ڈراپ  
کرو، دل بہت بے چین ہو رہا ہے اس سے ملنے  
کے لئے۔“ وہ ابھی ابھی ایئر پورٹ سے نکلے  
تھے کہ سکیٹی بیگم بولیں۔  
”لیکن ماما بھی تو آپ آئیں ہیں، پہلے گھر  
چلتے ہیں کل آجائے گا۔“

”گھر چلی گئی تو پھر ٹکنا مشکل ہو جائے گا۔  
میں بہت اداس ہوں اس کے لئے۔“  
”کیا بیٹے سے اداس نہیں ہو میں آپ۔“  
”تم اسے مل لیا ہے ناں اور اپنی بہو کو بھی  
دیکھ لیا ہے۔“ انہوں نے فرنٹ سیٹ پر اس کے  
ساتھ پیچھی رضیہ کو پیار سے دیکھا۔  
”مام پلیز ابھی آپ گھر چلیں صبح آفس  
جانے سے پہلے میں آپ کو واپس ڈراپ کر  
دوں گا۔“ اس کی بات پر وہ خاموش ہو گئیں۔

کوئی بات ضرور تھی ورنہ وہ یوں ان سے  
بحث نہیں کرتا تھا اور واقعی وہ رضیہ جنید کی موجودگی  
میں ادھر نہیں جانا چاہتا تھا کہ اس سے اسے کوئی  
بعید نہ تھی کہ وہ ان کے اسٹیشن کو ہی ان کے لئے  
طعنہ بناتی تھی۔

”بس آپا تقدیر کے سامنے کس کا زور چلتا  
ہے۔“ شام کو راشدہ بی بی خود ہی بہن سے ملنے  
اس کے گھر آ گئیں تھیں اور اپنے دل کا سارا بوجھ  
ڈھکے چھپے الفاظ میں ان کے کانوں میں انڈیل  
رہیں تھیں۔



”ہاں اسے تقدیر کے علاوہ اور کیا کیا جاسکتا ہے جو بات بھی سوچتی بھی نہ تھی لہٰذا میں ہوگئی۔“  
وہ بہت آزر دیکھ کر بولیں۔  
”لیکن تم نے یہ بہت بڑا قدم اٹھایا ہے

راشدہ۔“  
”تو پھر کیا کرتی، حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے آپا کہ مجھے اس کے سوا کچھ سوچا ہی نہیں۔“

”لیکن نکاح ایک بہت بڑا فیصلہ ہے راشدہ نجانے اب اس لڑکے کا کیا ری ایکشن ہو بالکل انجان اور اجنبی انسان کی کیا گارنٹی ہے۔ نجانے کب اس کی نیت بدل جائے اور میں تو جتنی ہوں اب تمہیں بیٹی کو طلاق دلوانے کی ضرورت ہی کیا ہے جب اتنا بڑا فیصلہ کر چکی ہو تو بسم اللہ کر کے اسی کے ساتھ رخصت بھی کر دو۔“  
انہوں نے اپنی دانست میں بہت اچھا مشورہ دیا انہیں، وہ گہری سانس لے کر ان کی طرف دیکھنے لگیں اور ان کی تائیدی نگاہوں پر نظریں چرا گئیں۔

”میں ایسا نہیں کر سکتی آپا، ڈرتی ہوں کہ میری ایسی پاکیزہ اور پاک دامن بیٹی کہ جس کے آپچل پر فرشتے بھی نماز پڑھتے ہوں گے اس کے کردار کو کوئی داغدار نہ کرے اور پھر میں ایسی خود غرض بھی نہیں کہ دوسروں کی خوشیاں برباد کے اپنی بیٹی کے لئے خوشیوں کے خواب دیکھوں اور ایسی خوشیوں کی گارنٹی ہی کیا ہے جو دوسروں کو دکھ دے کر حاصل کی گئی ہوں۔ اس کا تو پہلے ہی بہت احسان ہے ہم پر میں مزید اسے زیر بار نہیں کرنا چاہتی۔“

”میرا تو دل ہول رہا ہے سوچ سوچ کر نکاح اور پھر طلاق، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے راشدہ، کون ہے وہ لڑکا مجھے ملو اس سے میں بات کرتی ہوں۔“

”نہیں آپا، میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا

آپ تو میری بہن ہے اس لئے دل کا بوجھ ہمارے کرنے کے لئے ذکر لے بیٹھی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ بات پہلے ہی سمجھ جائے اور کسی اچھی جگہ اپنی بیٹی کی شادی کر دوں۔“  
”ہائے کیسی باتیں کرتی ہو راشدہ اور اگر بعد میں اسے کوئی مسئلہ ہو تو کیا کرو گی ایسی باتیں چھپی نہیں رہتی، اس کی زندگی عذاب ہو جائے گی اس کے لئے۔“

”پھر اس کی قسمت آپا، قسمت کا لکھا نہ ملا ہے نہ ملے گا۔“ ان کی مایوسی پر انہوں نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”کاش میں تمہارے دکھ سمیٹ سکتی لیکن بہت مجبور ہوں، اگر حسن زبان نہ دے سکے ہوتے تو مجھے اپنی بھانجی سے بڑھ کر کون عزیز تھا مجھے ان کا وقار ان کی عزت عزیز ہے راشدہ، جس شخص نے مجھے مان دیا ہو میں اس کا جھکا سر نہیں دیکھ سکتی اور میں تو اب شادی کی تیاری شروع کر رہی ہوں جیسے ہی حسن اپنا سارا بزنس سمیٹ کر پاکستان آئیں گے مگنی کے ساتھ ہی شادی کی تاریخ رکھ دیں گے۔“ ان کی باتوں پر انہوں نے سر جھکا کر اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے تھے اور لاؤنج میں بیٹھے احزم کی ہلکی ہوئی کرسی کی حرکت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

-----

پراچیلہ چونکہ ادھر ہی کی لیڈی ڈاکٹر کے زیر علاج تھی اس لئے مہینے میں دو بار چیک اپ کرانے کے لئے جب بھی آتی تو ادھر بھی چلی آتی۔ دن بہ دن اسے گھر کے کام کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر بھی اسے مسلسل مکمل بیڈ ریسٹ کی تاکید کر رہی تھی۔ لیکن وہ چاہنے کے باوجود ایسا نہ کر پار ہی تھی۔

شہزاد نے اسے سختی سے بیڈ چھوڑنے سے منع کیا تھا۔

”مجھ سے نہیں ہوتی یہ چاکریاں اپنے کچھ



کیسے جاتا اس لئے جلد ہی گاں سائید پر رکھ دیا۔  
 ”آپنی پلیزیشن مت لیں انشا اللہ سب  
 کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ انہیں تو تسلی دے کر  
 دروازہ بند کر بیٹھی کمرے سے باہر نکل آئی لیکن خود  
 بہت پریشان تھی، بچت کے ساتھ ساتھ اس میچے  
 کی ساری کی ساری تنخواہ بھی لگ گئی تھی۔ تنخواہ ہر  
 دوسرے دن چکر لگاتے تھے کھانے میں تھوڑے  
 بہت اہتمام میں بھی اچھا خاصہ خرچ اٹھ جاتا تھا۔  
 لیکن آنے والے دنوں میں اس سے بھی بڑے  
 بڑے اخراجات اسے نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے  
 آپریشن کا کہا تھا اور پھر پرائیویٹ آپریشن، اماں  
 نے تو سرکاری ہسپتال میں اس کا نام درج کروا  
 دیا تھا، لیکن وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھی لیکن  
 ابھی فی الحال خاموشی کے سوا اس کے پاس کوئی  
 چارہ نہ تھا۔

جیسے جیسے دن قریب آ رہے تھے ان کی  
 پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے اکاؤنٹ  
 میں ایک پیسہ بھی نہ بچا تھا کہ جو مشکل وقت میں  
 کام آ سکے۔ اس نے میڈم سے اس سلسلے میں  
 بات کی تو ان کا رویہ بالکل خلاف واقع تھا۔  
 ”بھئی ہم تو تنخواہ دار لوگ ہیں جیسے ہی تنخواہ  
 ملتی ہے خرچ ہو جاتی ویسے بھی بقول میرے شوہر  
 کے میرے ہاتھوں میں تو سوراخ ہیں، پچاس  
 ہزار کی رقم میں گزارا کرنا بہت مشکل ہے میرے  
 لئے۔“ ان کے صاف جواب پر وہ انہیں دیکھ کر  
 رہ گئی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ ان کا تعلق اچھے خاصے  
 متمول خاندان سے ہے ان سے اسے ہر گز بھی  
 ایسی بے رخی کی امید نہ تھی۔ وہ خاموشی سے وہاں  
 سے اٹھنے لگی۔

”سنو، تم احزم سے کیوں نہیں مانگ لیتی،  
 اچھا خاصا مالدار بندہ ہے اور پھر.....“ انہوں نے  
 معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بات ادھوری چھوڑ  
 دی تو وہ چڑ گئی۔  
 ”آپ کے مشورے کا بہت بہت شکریہ۔“

سوئچوں کو بلا لویا پھر اسے چھوڑ آؤ وہاں،  
 سہارا لے کر بیٹھے بٹھائے خدشوں کرو۔“ اس  
 سلسلے کے ہی دن بوکھلا گئیں تو وہ فوراً اس کے  
 لئے سوپ بنانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ نجانے  
 کیوں وہ اسے خود سے دور بھیجنے کا حوصلہ نہیں پاتا  
 تھا اپنے میں لیکن آخر کب تک وہ سب کچھ دیکھتے  
 ہوئے آپ بھیس نہیں بند کر سکتی تھی۔ اسے سخت  
 ہونے لگی تھی اٹھ کر کھڑی ہوئی تو چکر لگتی۔ صد  
 غم کہ گری بیڈ پر ہی تھی۔ وہ آفس سے آیا تو نیم  
 بے ہوشی سے پڑی تھی۔ وہ فوراً ہی اسے لے کر  
 بھاگ گیا تھا۔

”مجھے لڑکا پیدا ہونے کے آثار نہیں لگتے،  
 چھوڑ آنا اسے اس کی ماں کی طرف۔ لڑکا ہوا تو  
 گھر میں قدم رکھے ورنہ کوئی ضرورت نہیں اسے  
 یہاں لانے کی۔“ ان کی بے حسی پر اس نے  
 جاتے جاتے بہت غصے سے ماں کی طرف دیکھا  
 لیکن کچھ بھی کہنے کا وقت نہیں تھا۔

واپسی پر اسے ادھر ہی لے آیا اس کی حالت  
 دیکھ کر ان دونوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔  
 لیکن چند دنوں کی پھر پور توجہ پر اس کی طبیعت  
 اچھی خاصی سنبھل گئی تھی۔ اس دن بھی وہ اس کے  
 لئے فروٹ دوائیں اور گوشت لائی تھی جسے دیکھ کر  
 وہ بہت دل برداشتہ ہوئی۔

”بس کرو ریمیل کب تک آخر میرا ہی بوجھ  
 اٹھائے رکھو گی۔ جب سے تم نے گھر کی ذمہ  
 داری سنبھالی ہے اپنے لئے بھی کچھ کر سکی ہو تم، کتنا  
 خرچا ہو جاتا ہے روزانہ تم نے شہزاد سے بھی کچھ  
 بھی لینے سے منع کر دیا ہے۔“

”بس بہت بول چلی آپ، اب اور کچھ نہیں  
 بولیں گی، کیس یہ جوس پیئیں۔“ وہ ہر روز فریش  
 جوس بنانے کے لئے جو سر بھی لے آتی تھی، اس کی  
 ان سب باتوں کے دوران ہی وہ جوس تیار کر چکی  
 تھی۔ جسے وہ زہر سمجھ کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔  
 لیکن حلق میں تو آنسوؤں کا گولا پھنسا تھا وہ نیچے



وہ کہتی ہوئی اپنی سیٹ پر آگئی۔ لیکن بہت سوچنے پر بھی اسے اس کے سوا کوئی دوسری راہ بھائی نہ دیتی تھی۔

اس لئے اب وہ اپنی بکھرتی دھڑکنوں کو سمیٹتی اپنی تمام ہمتوں کو یکجا کر لی اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی دستک کے جواب میں "لیس" کی آواز پر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور پشت پر دروازہ بند کر کے خاموش کھڑی ہو گئی۔ وہ کسی فائل میں بری طرح غرق تھا۔ چند ثانیے گزرنے کے بعد کچھ چوکتے ہوئے دھیرے سے سر اٹھایا تو اسے وہم کو یقین میں ڈھلنے پر فوراً ہی در آنے والی منکراہٹ کو لبوں میں دبا کر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے فائل بند کر کے سائیڈ پر گئی۔ متذیب سی کھڑی وہ اپنے اندر کی جنگ سے نبرد آزما تھی اور وہ آج کئی مہینوں بعد اس کے اپنے کمرے میں موجودگی کے احساس میں گرا اس پر نظریں جمائے تھا لیکن وہ تو شاید نگاہوں کی اسی چمک سے خائف تھی کہ جسے وہ سنجیدگی طاری کرنے کے باوجود چھپانے میں ناکام رہا تھا۔

ایک لمحے کو تو دل میں آئی کہ واپس لوٹ جائے لیکن ضرورت اور مجبوری نے قدم تھام لئے۔

"زبے نصیب آئیے محترمہ۔" سوچوں کے طلاطم پر اس کی آواز نے بند باندھا تو دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنساتے دھیرے دھیرے قدم اٹھائی آگے بڑھ آئی۔

"تشریف رکھیے اور فرمائے کہ آج اس تاجیز کو شرف ملاقات بخشے کی سعی کیے کی۔" اس کی طنزیہ بات پر جھکی پلکیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تو نگاہوں میں شکوؤں کا سیلاب اندھا نظر آیا۔ جسے فوراً ہی چلمن گرا کر روکا گیا تھا۔

"ضرورت اور مجبوری انسان کو ہر اس در پر

لے جاتی ہے جہاں وہ جانا نہیں چاہتا۔" اس کے خود اذیتی کے اس انداز پر اس نے بغور اس کی جانب دیکھا اور گہری سانس لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم نے بھی سوچا ہے ریل کے تہائی مجبور یوں اور ضرورتوں کے تمام مسائل مجھ تک ہی آ کر حل ہوتے ہیں۔" وہ اس کے قریب کھڑا اپنی گہیر آواز میں گویا ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں کو جھپٹے سے ایک دوسرے سے آزاد کرنی پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسی لمحے فون کی بیل ہوئی تھی جسے وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سننے لگا۔ شاید کوئی اہم فون تھا اس لئے کچھ دیر لگ گئی۔ ابھی وہ رسیور بھی رکھ نہ پایا تھا کہ دروازہ ٹاک کرنا ہوا ایک لڑکا فائلیں اٹھائے اندر داخل ہوا۔

"سر پلیز ان لیٹرز پر سائن کر دیں، ٹی سی ایس ایجنٹ ویٹ کر رہا ہے۔" دس منٹ لگے تھے اس کام کو نمٹانے میں انٹرکام بیل پر لڑکے نے رسیور اٹھا کر سنا اور پیغام اسے دیا۔

"سر حیدر عثمان کافی دیر سے آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔ تین دن سے وہ مسلسل چکر لگا رہے ہیں اور آپ سے ضروری ملنا چاہتے ہیں۔"

"او مائی گاڈ! ٹھیک ہے تجھو میں نہیں۔"

"انہیں بھی دس منٹ میں ہی فارغ کرنا چاہتا تھا۔" لیکن ہر دوسرے منٹ آنے والے فون اس کے انتظار کو طویل کر رہے تھے۔ وہ شخص اٹھ کر گیا تو ریسپشن گرل اندر چلی آئی۔

"سر مس رضیہ جنید بار بار فون کر رہی ہیں آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔"

"کیوں انہیں کیا پر اہم ہے۔" اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"سر انہوں نے پیراڈائز شاپنگ سینٹر سے شاپنگ کی ہے اور پے منٹ کے لئے یہاں کا کانیکٹ نمبر دیا ہے انہوں نے پیراڈائز والے خود بھی



اسی بار فانی کر چکے ہیں، لیکن اسٹریڈی ہونے سے بات نہیں ہو سکی۔

کے پاس یہ مطلب ہے، سچائی، اس نے کی ہے منٹ میں کیوں کروں۔ اسی وقت فون کی بیل ایک بار پھر ہوئی۔ اس نے جھنجھلا کر دیکھا اور پھر اٹھالیا۔

”ہیلو اجزم سپیکنگ۔“

”سر آپ کی مسز نے ہمارے ہاں سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ کی شاپنگ کی ہے اور کہا ہے کہ منٹ آپ کریں گے۔“

”واٹ ڈیڑھ لاکھ کی شاپنگ۔“

”لیس سر، کیڑے، جوتے، جیولری.....“

”بس بس مجھے سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے مسز اور نہ ہی میں پے منٹ کروں گا جس نے شاپنگ کی ہے پیسے بھی اسی سے نکلواؤ۔“ وہ اس قدر بد اخلاق تو نہیں تھا لیکن اس وقت ہو گیا تھا

اور اسی کھٹاک سے فون بند کیا اس وقت وہی لڑکا

دوبارہ ایک فائل اٹھائے اندر چلا آیا۔

”سر پلیز یہ ایک فائل چیک کر لیں۔“

گیا تم سب کو کیا باہر کوئی جنگ لگی گئی ہے یا آگ

جو ہر کوئی نہیں بھاگا آ رہا ہے۔“ وہ ایک دم ہی

دھاڑا تھا، وہ لڑکا ہم کو فوراً ہی پیچھے ہٹا۔

”رکھ دو اسے اور جاؤ یہاں سے اور ہاں

جب تک میں نہ کہوں کوئی نہیں آئے گا یہاں اور

نہی کوئی کال رسیو کروں گا انڈر سٹینڈ۔“

”لیس سر!“ لیکن ابھی وہ باہر نکلا ہی تھا کہ

اس کا بیل فون بج اٹھا۔

رضیہ جنید کا نمبر دیکھ کر ہونٹ بھیج گیا، اگر

خود اس کے نزول کا خطرہ نہ ہوتا تو اسے آف کر

دیتا۔

”ہاں جلدی بولو کیا بات ہے؟“

”بیل کیوں آف کر رکھا تھا تم نے صبح سے

اور پھر ڈائری والوں کو پے منٹ کرنے سے انکار

کیوں کیا؟“ شاید وہ بھی بھری بیٹھی تھی۔

”ہاں کیا ہے انکار کیونکہ میں اتنی بڑی رقم

کی پے منٹ نہیں کروں گا۔“

”واٹ ڈیڑھ لاکھ کی شاپنگ کو منٹ پے منٹ،

منگیتر ہو ہوں میں تمہاری حق ہے میرا تمہارے

پیسوں پر۔“ وہ چٹکی تھی۔

”منگیتر ہو بیوی نہیں ہو کہ تمہاری ہر جائزہ

نا جائز بات ماننا میری مجبوری بن جائے اور اچھا

دن رات کی محنت سے کمایا گیا روپیہ تمہاری ان

فضول خرچیوں پر لانا پھر دوں۔“

”او یو تم میری انسٹ کر رہے ہو زوی۔“

”تم اسے جو بھی سمجھو لیکن میں اتنی بڑی رقم

کی ادائیگی نہیں کروں گا ابھی اور نہ آئندہ بھی اور

اب یہاں فون مت کرنا مجھے۔“ اس نے بیل

آف کر کے ٹیبل پر پٹا اور سر تھام لیا۔

”مم۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے میں چلتی ہوں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فون پر اس کی باتیں سن کر

عجیب سے احساسات سے درجہ ہوئی تھی وہ۔

”کیس میں جا رہی ہوں انڈر سٹینڈ۔“ وہ

اس کے بڑھتے قدم دیکھ کر حکمانہ انداز میں بولا

اور اٹھ کر تین چار قدم کے فاصلے پر رکھے ٹیبل

سے جگ اٹھا کر گلاس میں پانی اٹھایا اور اسی پر

بیٹھ کر پی لیا۔ کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا لیکن ہونے کی

کوشش کی پھر اپنی سیٹ پر آ گیا شاید اس کے

دماغ سے بوجھ ابھی کم نہ ہوا تھا اس لئے سیٹ

سے سر ٹپک کر آنکھیں موند لیں چند منٹ بعد وہ

تین لمبی لمبی سانسیں لے کر سر جھٹک کر آنکھیں

کھولی تو وہ اسی پر نظر پڑا جس جہانے ہوئے تھی تصادم

پر آنکھوں کا زواہ بدل گئی شاید اس کا یہ انداز ہی

اس کی ساری بیزاری دور کر گیا تھا۔ اسی لئے تو

فوراً ہی ایک بھر پور مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا

احاطہ کیا تھا۔

”ہاں اب کہو، کون سی مجبوری نہ چاہتے



ہوئے بھی تمہیں یہاں تک کھینچ لائی۔“ اس نے بہت سادہ اور نرم لہجے میں پوچھا۔ لیکن وہ گوگو کیفیت میں خاموش بیٹھی رہی کہ اس کے ذہن کی سوئی ابھی تک رضیہ جنید سے کہی گئی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔

”منگیتیر ہو بیوی نہیں ہو کہ تمہاری ہر جائز و ناجائز بات ماننا میری ”مجبوری“ بن جائے۔“

”مجبوری کا لفظ اس کے دماغ میں کھٹک گیا تھا کہ اس سے تو اس کا قانونی اور شرعی تعلق تھا تو کیا.....“

”میں نے کچھ پوچھا ہے ریمیل۔“ وہ اس کی ابھی گئی پلکوں پر نظریں جمائے منتظر تھا۔ اس کے پوچھنے پر وہ لٹی میں سر ہلا گئی۔

”نہیں کچھ نہیں بس یونہی چلی آئی تھی، اب میں چلتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی۔

”بیٹھ جاؤ ریمیل اور مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔“ اس کے سنجیدگی سے کہنے کے باوجود وہ جانے کے لئے قدم بڑھا چکی تھی لیکن دوسرے ہی بل جھٹکے سے رکنارٹا اپنا ہاتھ مضبوط گرفت میں محسوس ہوا تو مڑ کر دیکھا۔

”پلیز ہاتھ چھوڑیں میرا۔“

”کیوں کیا اتنا بھی حق نہیں ہے میرا۔“ لہجہ کی گیمیرتا سے اس کا دل لرز گیا۔

”پلیز ہاتھ چھوڑیں۔“ اس کے ہاتھ کا پیش دیتا لمس اس کے وجود میں آگ سی دہکا گیا تھا۔

”اچھا بیٹھو تو سہی۔“ لیکن وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں کھڑی اپنی نم ہوئی پلکوں کو جھپکتی رہی۔

”اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہارا ہاتھ چھوڑ دوں تو بیٹھ جاؤ اگر نہیں بیٹھو گی تو میں یہی مجھوں کا تم چاہتی ہو کہ تمہارا یہ ہاتھ صدا یونہی میرے ہاتھ میں رہے۔“ اس کے طویل شرارت آمیز جملے نے اس عجیب دورا ہے پر لاکھڑا کیا تھا۔ وہ

متذنب سی اپنے ہاتھ کو اس کے ہاتھ میں پھنسے دیکھنے لگی۔ اس کی مزید سخت ہوتی گرفت سے نجات پانے کے لئے آخر وہ دھب سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے بہت آہستہ سے ہاتھ چھوڑا تھا۔ اس نے اپنے سرخ ہونے ہاتھ کو سہلایا۔

”یعنی کے آج فیصلہ ہو گیا۔“ اس نے اپنی آواز میں سوز پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔

”جو بھی سمجھیں آپ لیکن میں یہاں کوئی فیصلہ کروانے نہیں اپنی ضرورت کے تحت آئی تھی۔“

”اور بتائے بنا ہی جا رہی تھیں کیوں؟“ اس کے سوال پر لب پہنچ کر دوسری طرف دیکھنے لگی اور ایک لمحے میں فیصلہ کر کے گویا ہوئی۔

”مجھے..... کچھ..... پیسے، یعنی ایڈوانس۔“

”جو کہ آہستہ آہستہ میں اپنی تنخواہ میں سے کٹوا دوں گی۔“ وہ تیزی سے بولتی اب بھی دوسری جانب دکھ رہی تھی۔ اس نے پہلے تو حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔

”کتنے؟“

”تقریباً پچاس ہزار۔“

”ہوں۔“ اس نے چیک بک اٹھائی تو وہ ایک دم بول اٹھی۔

”نہیں، میں اپیلی کیشن لائی ہوں ساتھ آپ اس پر سائن کر دیں۔“ اس نے بیگ میں سے ایک کاغذ نکال کر اس کے سامنے کیا۔

”مجھے آپ سے نہیں کمپنی اکاؤنٹ سے چاہیے۔“ اس کی بات پر وہ گہری سانس لیتا ہوا کرسی سے ٹیک لگا کر چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر مسکراہٹ لبوں تلے دبا کر گویا ہوا۔

”منگیتیر نہیں بیوی ہو تم میری اور فی الحال تو تمہارا پورا حق ہے میری جیب پر۔“ اس کے شرارت آمیز انداز جملے پر اس کے چہرے پر کئی



بیک بھر کر گزرتے تھے خود کو لپوڑ کرنے کے لئے  
 وہ بار بار پھر مٹی۔  
 وہ جی نہیں سمجھے کوئی شوق نہیں ہے ایسے حق  
 استعمال کرنے کا۔" ناراض لہجہ اس کی سماعت  
 سے گزرا۔

"ہاں میں بھول گیا تھا کہ اس کا فیصلہ تو  
 ابھی ہو گیا، لیکن کیا آپ مجھے چند منٹس کے لئے  
 انتظار دیں گی کہ میں آپ سے پوچھ سکوں کہ  
 ہزار آپ کو ایسی کیا ضرورت آن پڑی جب کہ  
 اب تو آپ کی سیکری بھی اچھی خاصی ہے اور کوئی  
 دوسرا بوجھ بھی آپ کے کندھوں پر نہیں میرا  
 مطلب ہے کہ پہلے تو آپ کو بہن کی شادی کے  
 لئے..... او آئی سی کہیں آپ کو اپنی شادی کی  
 تیاریوں کے لئے تو....." اس کی بات پر اس نے  
 چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آئی مین شاید خالہ جان نے تمہارے  
 لئے کوئی اچھا اور مناسب بر تلاش کر لیا ہو گا جس  
 کے لئے اب تمہیں لون لینا پڑ رہا ہے۔" اس کی  
 زچھی نگاہوں کے تیر بھی اس کی زبان بند نہ کر  
 سکے۔

"تو اس میں ایسے طنز کی کیا بات ہے، آخر  
 ایک نہ ایک دن تو ایسا کرنا ہی ہے۔" اس کے  
 اس انداز پر وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"مجھے ضرور ملوانا اس شخص سے جو تمہاری  
 اپنی پسند کا ہوا۔ تم پر زبردستی یا حادثہ مسلط نہ ہوا  
 ہو گا۔" وہ ان کی سنجیدگی پر لب کاٹ کر رہ گیا۔  
 "بہت خوش قسمت ہو گا وہ شخص جسے تم اپنی  
 خوش و رضا مندی سے اپنی زندگی میں شامل کرو  
 گی۔"

"پلیز سر!" رندھے ہوئے لہجے کو قابو  
 کرنے چند لمحے لگے تھے اسے۔

"اپیلی کیشن پر سائن کر دیں پلیز۔"  
 "اور اگر نہ کروں تو۔" اس کے جواب پر وہ

جھٹکے سے اٹھ کر تیزی سے بیرونی دروازے کی  
 طرف بڑھی لیکن وہ چند قدم پر ہی اس کے سامنے  
 کھڑا تھا۔  
 "پنیں سامنے سے جانے دیں مجھے۔"  
 "اچھا یہ ناراضی ختم کر دو اور مجھے بتاؤ کیا  
 مسئلہ ہے۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا کوئی مسئلہ نہیں  
 ہے، پرے نہیں جانے دیں مجھے۔"

کے بالکل قریب کھڑا اس کے حواس کم کر رہا تھا۔  
 اسی وقت دروازہ کھلا اور مسز خان نمودار ہوئیں  
 لیکن اگلے ہی لمحے ٹھٹھک کر وہ ہیں رک گئیں۔ اس  
 کی نظر فوراً ہی ان پر پڑی تھی اس کی نظروں کے  
 تعاقب میں اس نے بھی مڑ کر دیکھا۔

"او آئی ایم سوری، آئی ایم ویہی ویہی  
 سوری۔" وہ کہتی واپس مڑ کر دروازہ بند کر گئیں۔

اس نے دوبارہ گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا  
 تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کیسی  
 عجیب پوچھن تھی یہ، وہ جانا چاہتی تھی لیکن وہ اس  
 کی راہ رو کے بالکل اس کے قریب کھڑا تھا۔

"او مائی گاڈ!" وہ دونوں ہاتھوں سے سر  
 تھام کر قریب پڑے صوفے چیمیر پر گر گئی۔  
 "اب کیا ہو گا؟"

"وہ تو پہلے ہی ہمارے متعلق شکوک و  
 شبہات میں مبتلا ہیں، اف میرے خدایا، اب کیا  
 ہو گا اب تو وہ اور بھی....." وہ گھبرائے ہوئے لہجے  
 میں پریشان سی بول رہی تھی جب کہ وہ وہیں کھڑا  
 دیکھتی سے اسے دیکھ رہا تھا اس کی نظر اس پر اور  
 اس کی مسکراہٹ اسے آگ لگا گئی۔

"آپ ہنس رہے ہیں، تماشا بنا کر رکھ دیا  
 ہے آپ نے مجھے، بدنام ہو جاؤں گی میں پورے  
 آپس میں۔"

"کیوں، میں نے تو کسی سے نہیں کہا کہ آؤ



تم شادی کیو ہمارا۔" وہ کہتا ہوا صوفے کی دونوں جانب ہاتھ رکھ کر جھکا تھا۔  
 "اور اگر میرے نام سے بدنام ہو بھی جاؤ تو کیا ہے آخر۔۔۔۔۔"

آپ۔۔۔ "صرف تمہارا شوہر۔" اس کے مزید قریب ہونے پر وہ رخ پھیر گئی۔  
 "کیوں کیا اس حقیقت سے انکار کر سکتی ہو۔" اس کی لرزنی پلکوں کو نگاہوں کی گرفت میں لیا۔

"حقیقت کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے اعتماد اور یقین بہت ضروری ہوتا ہے۔" وہ صوفے کی بیک پر سر رکھے مسلسل دوسری جانب دیکھ رہی تھی۔

"ایسا سب کچھ تو تمہارے نام لکھ کر دے چکا ہوں تمہیں اور کیا چاہتی ہو۔" وہ گلیسر سے لکچ میں اسے پورے جذب سے دیکھتے ہوئے بولا لیکن اگلے ہی پل پیچھے ہٹ کر اپنی جون میں لوٹ آیا۔

"اور اگر اب بھی تم چاہو تو ابھی سب کو اکٹھا کر کے الا اعلان بتا دیتا ہوں کہ خواتین و حضرات ان سے ملیے یہ ہیں میری۔۔۔۔۔"

"بھاڑ میں جا میں آپ اور آپ کے یہ اعلان۔" وہ کہتی ہوئی تیزی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا قبضہ خاصا فلک شگاف تھا وہ مڑا اور ٹیبل پر رکھے کاغذ کو اٹھا کر پڑھا اور پھر مسکراتے ہوئے پھاڑ کر ڈسٹ بن کی نذر کر دیا۔

وہ خاصے خوشگوار موڈ میں انگلی پر کی رنگ گھماتا سیٹی پر کوئی شوخ سی دھن بجاتا گھر میں داخل ہوا تھا۔ لیکن اس وقت اس کا سارا موڈ غارت ہو گیا جب وہ سامنے ہی ڈرائنگ روم میں

بیٹھی ماما سے فرفر انگلیش بولتی اس کی شکایتیں لگ رہی تھیں۔

"آئی! آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ کتنی سکی ہوئی میری۔ کیا عزت رہ گئی ہوگی میری ان کی نظر میں، کتنا مذاق اڑایا ہوگا ان سب نے میرا۔"

"السلام و علیکم ماما!" اس کی آواز پر وہ دونوں چونکیں۔

"تو آگے تم، پوچھیں آئی اس سے کیوں کیا اس نے ایسا؟"

"مام پلیز ایک کپ چائے۔" اس نے اسے مکمل نظر انداز کرتے ہوئے ان کے پاس ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے فرمائش کی انہوں نے ملازم کو آواز دے کر چائے کا کہا۔ اس نے پھر بولنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں روک دیا۔

"میں اس وقت تمہاری کوئی بک بک سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"تم اپنی عزت کروانا جانتی کب ہو؟"

بھی ایک دم پھٹ پڑا تھا۔

"تمہیں احساس ہے کہ عزت کیا چیز ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمام زندگی کما تا رہوں گا اور تم یونہی بے دریغ لٹائی رہو گی اور میں اسی طرح ہمیشہ تمہاری انگلیوں پر ناچتا رہوں گا۔ نو، امبا سبل، بہت ہو چکا میں جتنا تمہارے لئے کر سکتا تھا کر چکا، میں کوئی حرام نہیں کمانا، دن رات ایک کر کے یہ مقام حاصل کیا ہے میں نے اور جو مقام میں نے تمہیں اپنی زندگی میں دینے کی کوشش کی تم اس کے قابل نہیں ہو۔"

"او کے آگے ایک لفظ بھی مت کہنا، تم خود کیا چیز ہو، انتہائی گھٹیا اور دقیانوسی انسان، ٹھیک



”جی نہیں مجھے کوئی خوف لاحق نہیں ہے اور آپ بھی اس حالت میں وہاں جا کر کیا کریں گی آخر۔“

”اتنے شوق اور محبت سے انوائٹ کیا ہے خالہ جان نے ہمیں تو کیا انکار کر دیتے ہم۔“ تو پھر جائیں ناں آپ میرا جانا کوئی ضروری نہیں ہے۔“ وہ ایک دفعہ پھر چادر تان کر لیٹ گئی۔

”فارگاڈ سیک ریمبل۔“

”اگر وہ جانا نہیں چاہتی تو تم اسے کیوں مجبور کر رہی ہو راحیلہ۔“ اماں نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر نوکا وہ تو وہ بھی ان کے پیچھے باہر چلی آئی۔

وہ جانا چاہے نہ چاہے اماں لیکن آپ نہیں چاہتیں کہ وہ جائے۔

”ہاں تو فائدہ بھی کیا ہے۔“ انہوں نے گہری تاسف آمیز سانس لی۔

”اماں پلیز ایسی مایوسی اچھی نہیں ہوتی۔“ وہ ان کے پاس بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”ہم کوئی ناجائز کام تو نہیں کر رہے انہوں نے بلایا ہے ہمیں جانا ہے اور بس۔“

”راحیلہ تو نہیں سمجھتی میرے اندیشوں کو۔“ وہ انتہائی پریشان لہجے میں بولیں گئیں۔

”میں سب سمجھتی ہوں اماں ایسی کوئی بچی نہیں ہوں لیکن خدا نے جو چاہا وہ ہو کر رہے گا اس کے اس سے ملنے یا نہ ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نکاح کوئی معمولی چیز نہیں۔ میرا تو شہزاد سے نکاح بھی نہیں ہوا تھا پھر بھی میں نے منگی ہوتے ہی انہیں اپنا سب کچھ مان لیا تھا اور یہ تو پھر۔۔۔۔۔“

”بس کر راحیلہ ایسی باتیں کر کے میرا دل نہ دہلا کوئی رشتہ کئی لعنت نہیں اس کا اس کے ساتھ جو حماقت مجھ سے سرزد ہو گئی ہے میں نہیں چاہتی کہ

”بس اٹھ جاؤ اب میں تمہاری ایک بات نہیں سنوں گی۔“ اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔

”آپی پلیز تنگ مت کریں مجھے کوئی موڈ نہیں ہے وہاں جانے کا۔“

”کیوں موڈ نہیں ہے۔ کس بات کا ڈر ہے آخر تمہیں، اپنے آپ سے خوفزدہ ہو گیا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“

”اس نے اس کے اوپر تنی چادر کو کھینچا۔“



میری بچی کے لئے زندگی کا روگ بن جائے۔“  
”اچھا تو میں پھر آپ خدا کے گھر سے اچھی  
امید رکھیں اور اسے چلنے کے لئے کہیں۔“ وہ  
اسے دیکھتی ہوئی اٹھ کر اس کے کمرے میں  
آئیں۔

”چل اٹھ جا میری بچی اکیلی گھر میں رہ کر  
کیا کرے گی، جلدی سے تیار ہو جا۔“  
”لیکن اماں میں کروں گی کیا وہاں جا کر۔“  
”جو ہم سب کریں گے تم بھی کر لینا۔“

راحیلہ ایک بار پھر نمودار ہوئی تھی۔  
”نری بدھو کی بدھو ہوتی ہیں اور تم ہو کہ چار سال دفتروں  
اتنی تیز طرار ہوتی ہیں اور تم ہو کہ چار سال دفتروں  
کے دھکے کھا کر بھی کچھ نہیں سیکھا تم نے۔“  
”ماسٹر یور لینکج آپی۔“ اس نے مصنوعی  
دھمکی دی۔ لیکن وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتی  
اس کی کپڑوں والی الماری کی طرف بڑھ گئی۔

”کیسے مرے مرے رنگ پہنتی ہو تم، بوڑھی  
روح، ہاں بس یہ ٹھیک ہے ویسے بھی میں نے  
تمہیں یہ کپڑے پہنے بھی نہیں دیکھا۔“ وہ گہرا سبز کلا کا  
سوٹ پکڑے کھڑی تھی جسے دیکھ کر اس کا دل  
یکبارگی بہت زور سے دھڑکا تھا۔ اس دن کی  
میننگ کے بعد اس نے اسے چھوٹا تک نہیں تھا  
یونہی لٹکا تھا۔

”نہیں میں یہ نہیں پہنوں گی یہ دیکھیں ابھی  
تھوڑے دنوں پہلے ہی خریدا ہے میں نے۔“ بلیک  
اورنج اور ریڈ کلا کا خوبصورت کمبی نیشن تھا۔  
”ہاں چلو پھر فٹ کرو۔“ وہ کہتی ہوئی خود  
ہی تیار ہونے چل دی۔

”بس کریں آپنی کیا کچھ تھوپ رہی ہیں  
میرے منہ پر۔“

”بس ہلنا نہیں خاموشی سے بیٹھی رہو۔“  
لیکن آئینہ دیکھنے پر اس کی چیخیں نکلی گئیں۔

”آپی کیا بنا دیا ہے مجھے میں کوئی ماڈل گرل

نہیں ہوں اور نہ ہی کسی فیشن شو میں جا رہی ہوں  
نہیں پیچھے منہ دھو کر آؤں۔“

”دیکھو ریمیل اگر تم نے منہ دھویا تو مجھ  
سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ لیکن وہ سنی ان کی کرتی  
باہر نکل گئی اور رگڑ رگڑ کر منہ دھو کر آئی تھی۔ میک  
اپ تو اتر گیا تھا لیکن اس کے آجرا بھی بانی تھے  
جو اس کے چہرے کو انوکھا روپ بخش رہے تھے۔  
راحیلہ اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

”چلو ایسے بھی ٹھیک ہے، میں تو ایسے ہی  
بے وقوف ہوں، میری بہن تو لاکھوں میں ایک  
ہے جسے میک اپ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔  
لیکن یہ ہلکی پھلکی سی جیولری تو پہن لو۔“ ان کے  
کہنے پر اس نے بنا کسی احتجاج کے ان کے ہاتھ  
سے ساری چیزیں لے لیں۔ سادہ سی جیولری بنا کر  
دوپٹے کو پن اپ کرنے لگی تو اس نے وہ جھٹکی لیں  
رہنے دوا لیے ہی۔

”چلو ابھی لڑکیوں جلدی کرو گاڑی  
دروازے پر آگئی ہے اور تم لوگوں کی ابھی تیاری  
ہی پوری نہیں ہوئی۔“ اماں کی آواز پر وہ جلدی  
سے چادر اڑھنے لگی۔

”رکھو اسے پرے ہمیں کون سا پیک  
ٹرانسپورٹ پر دھکے کھانے ہیں ابھی پندرہ منٹ  
منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ آخر پینٹل گاڑی  
آئی ہے ہمارے لئے۔“

”دوسروں کے مال پر اتنا مت اترا میں آپا  
یہ تو چار دن کی چاندنی بھی نہیں ہے۔“ اس نے  
انہیں چھیڑا۔

”اف تمہاری یہ حقیقت پسندی لے ڈوبے  
گی تمہیں۔“ انہوں نے اسے باہر دھکا دیا۔

”میں سرخ روش پر چلتی گاڑی پورچ میں جا  
رہی باوردی ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر اماں کی  
طرف کا دروازہ کھولا جب کہ وہ دوسری طرف کا  
دروازہ خود ہی کھول کر باہر نکلی تھی ایک ہاتھ



اندروں کی علامت تھی جو کہ وہ اس محسوس کر رہی تھی  
 وہ ان کے گھر رنگوں کی کمی نہ تھی خوبصورت اور  
 جدید انداز میں سجایا گیا۔ ان کے گھر سے گھر کے  
 برابر تھا جہاں میں قیمت فریج شو فریج اور ٹلف  
 لٹاؤں اور رنگوں کے مصنوعی واصلی پھول لٹا ہوا  
 دکھا رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ  
 تین سٹیب نیچے اتر کر سامنے ہی رکھا جھاری ساڑ  
 فٹ ایکوریم آنے والوں کی توجہ خود بخود ہی اپنی  
 جانب مبذول کروا لیتا تھا۔ اماں تو چونکہ پہلے بھی  
 کئی بار یہاں آچکی تھیں اس لئے ان کے لئے یہ  
 سب نیا نہ تھا لیکن وہ دونوں عمر زدہ ہی ہر چیز کو  
 دیکھتی ان کے پیچھے چل رہی تھیں۔

”ریمل مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے ہم  
 طلسم کدہ میں آگئے ہیں۔“ آیا نے سرگوٹی کی وہ  
 لوگ صوفوں پر بیٹھ گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں  
 ایک مؤدب ملازم ٹرائی کھینٹا ہوا چلا آیا۔  
 ”مجھے تو لگتا ہے کہ اگر میں وہ میسے بھی  
 یہاں رہوں نہ تو بھی اس گھر کی خوبصورت  
 چیزوں کی کتنی نہیں کر سکتی۔“

”آیا آپ نے ازم حسن کو دیکھا ہے۔“  
 ان کی سرگوٹی پر اس نے بے خودی کیفیت میں  
 پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔  
 ”نہیں کیوں؟“ لیکن شاید وہ اپنے دھیان  
 میں نہ تھی نہ جانے کس رو میں بہہ گئی تھیں۔  
 ”اگر آپ اسے دیکھیں تو جانیں کہ اس  
 کی شخصیت کے سامنے یہ ساری خوبصورتیاں بے  
 ہیں۔“ وہ اپنے حواسوں میں کم بو بڑا لی گئی۔  
 راحیلہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا دم  
 ملازم نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی تو  
 وہ اسے بھی نا بھی سے دیکھے گئی۔

”بی بی چائے لے لیں۔“  
 ”ہاں، اوں، اچھا۔“ اس نے پیالی تھام کر  
 پریشان سے انداز میں راحیلہ کی جانب دیکھ کر

دراڑے پر رکھے سر اٹھا کر سامنے کھڑی  
 لیٹان عمارت کو دیکھا تو اسے اپنا آپ بہت  
 عجیب محسوس ہوا۔ پہلی بار جب وہ یہاں  
 آئی تو اسے حواسوں میں ہی کبھی جو اس کی  
 شان محسوس کو دیکھتی۔ عمارت سے ہٹ کر  
 اس کی نظر روش کے دونوں اطراف پھیلے وسیع و  
 عریض لان کی طرف گئی تو دنگ رہ گئی۔ روشن کے  
 ایک جانب کے لان میں بہت سے بڑے بڑے  
 درختوں کی بہتات بھی طول و عرض پر پھیلے اس  
 لئے کو ایک مضبوط لوہے کی جالی دار جگہ سے  
 احاطہ کر اس میں دنیا کے خوبصورت ترین  
 پھولوں کو رکھا گیا تھا جنہیں درختوں پر چھپاتے  
 پڑتے اپنی اس قید کا بالکل احساس نہ تھا  
 خوبصورت رنگ برنگے مور اپنے پر پھیلائے  
 لیے جھنکار رہے تھے جیسے انہیں خوش آمدید کہہ  
 رہے ہوں، دوسری جانب کے لان کے وسط میں  
 ایک خوبصورت نوارہ پانی کے موٹی بکھیر رہا تھا  
 اس میں سے سورج کی شعاعیں منعکس ہو کر  
 سورج کا منظر پیش کر رہی تھیں نوارے کے گرد  
 سنگ مرمر کی چار دیواری جس کے چاروں کونوں  
 پر پتھر کی سفید چھتیاں اپنی لمبی کردنیں جھکائے پانی  
 جیتی انتہائی خوبصورت اور دل فریب لگ رہی تھیں  
 وہ مبہوت سی اس سارے منظر کو آنکھوں میں  
 سموئے کھڑی تھی کہ راحیلہ نے ٹھوکا مار کر اسے  
 سامنے کھڑی سلمی بیگم کی موجودگی کا احساس  
 دلایا۔

”ماشا اللہ آج تو میرے گھر میں بھی  
 اجالے اتر آئے ہیں۔“ وہ انہیں لئے سنگ روم  
 میں چلی آئیں ان کے لہجے میں محسوس کی جانے  
 والی خوشی تھی۔

”ہاں کسی نے سچ کہا ہے بیٹیاں ہی گھر کی  
 رونق ہوتی ہیں۔ کیسی روشنی سی اتر آئی ہے رنگ  
 ہی رنگ بکھر گئے ہیں ہر طرف۔“ اور یہ تو ان کے



اسے ہی دیکھ رہی تھی وہ اس کے چہرے پر پھیلے  
تاثرات کو سمجھ سکی۔

”ایسے کیا دیکھ رہیں ہیں آپ؟“  
”تم نے ابھی کیا کہا؟“  
”میں نے؟“

”ہاں کیا کیا تھا تم نے۔“  
”کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ صاف مکر  
گئی لیکن وہ جان گئی تھی کہ ابھی ابھی اس نے جو  
کچھ کہا وہ عالم ہوش و حواس میں نہیں کہہ سکتی تھی  
اس لئے گہری سانس لے کر رہ گئی۔  
”آپ احزم کہاں ہے وہ نظر نہیں آ رہا۔“  
اماں کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو وہ فوراً ان کی  
جانب دیکھنے لگی۔

”ہاں راشدہ وہ دراصل مجھے تو خود اچھا  
نہیں لگا اس کا جانا لیکن اس لڑکے نے خود کو  
پرنس میں اتنا انوال کر لیا ہے کہ نہ اپنا ہوش ہے نہ  
کسی دوسرے کا۔ دیکھو ناکل خود ہی بیٹھ کر یہ سارا  
پروگرام بنایا اسی وقت فون پر سمجھیں دعوت دی اور  
شام کو کہنے لگا مجھے تو ایک اہم مینٹنگ میں اسلام  
آباد جانا ہے، جیسے ہی فون آیا اٹھ کر چل دیا۔  
بہر حال کہہ دیا تھا میری طرف سے معذرت کر  
لیجے گا۔“

”نہیں کوئی بات نہیں آپ واقعی کوئی اہم  
مینٹنگ ہوگی۔“ انہوں نے جیسے خود کو تسلی دی تھی  
لیکن اندر سے ان کا دل بچھ سا گیا اور ان دونوں  
کی حالت بھی شاید ان سے مختلف نہ تھی۔  
”ارے بچیوں کیا غیروں کی طرح ایک جگہ  
بیٹھی ہو جاؤ گھوم پھر کر گھر دیکھو تمہارا اپنا ہے سب  
کچھ۔“

”اماں اماں صفیہ۔“ انہوں نے بوڑھی ملازمہ  
کو آواز دی۔

”بھئی بچیوں کو لے جاؤ اور پورا گھر دیکھاؤ۔“  
وہ ملازمہ کی ہمراہی میں آگے بڑھیں تھیں۔

ڈانگ ٹیبل پر سب سے لوازمات ان کی تعداد سے کئی  
گنا زیادہ تھے۔

”لو بیٹا کھاؤ ناں تکلف تا بر تو یہ سب میں  
خاص طور پر تم لوگوں کے لئے اپنے ہاتھوں سے  
بنائے ہیں۔“ انہوں نے بہت محبت بھرے اصرار  
سے انہیں ہر چیز کھلائی تھی۔

”خالہ جان کیا آپ کھانا خود ہی بناتی  
ہیں۔“

”ہاں بیٹا! میں ایک مکمل گھریلو عورت ہوں  
کھانا خود بناتی ہوں کام والی ماسی کے کچھ  
کھڑے ہو کر سارا کاروائی ہوں۔ ہاں بس کچھ  
کی دیکھ بھال اور اوپر کے کاموں کے لئے یہ ایک  
ہی کل وقتی ملازم ہے۔ کچھ دن ہوئے یہ اپنی اماں  
کو بھی گاؤں سے اپنے ساتھ لے آیا اس لئے  
مجھے اب کچھ سہولت ہو گئی ورنہ احزم کو ملازمین کی  
لمبی لائنیں پسند نہیں ہے۔“ وہ چاروں اب لان  
کی طرف عرض تپ رہی تھیں۔

”تو آئی پھر یہ اتنے سارے پرندوں کی  
دیکھ بھال کون کرتا ہے۔“ اس نے بہت دلچسپی  
سے پیچھے کے اندر ادھر سے ادھر ایک ٹرائی  
سے دوسری شاخ پر اڑتے پرندوں کو دیکھتے  
ہوئے پوچھا۔

”اس تمام عرصے میں اس نے پہلا سوال  
کیا تھا۔“

”اے یہ سب تو احزم کا شوق ہے اور ان  
کی دیکھ بھال یہاں کی صفائی ستھرائی کے لئے تو  
ایک لمبی لائنیں لگا رکھی ہے اس نے اور تو اور  
ڈاکٹر بھی متعین ہیں کہ ہر ہفتے آکر ان کا چیک  
اپ کرتے اور انہیں حفاظتی ٹیکے لگاتے ہیں۔“

”کوئی ایک آدھ شیر بھی پال لیتے تو پورا  
چڑیا گھر تیار ہو جاتا۔“ وہ لان میں آزاد پھرتے  
موروں کے ساتھ کھلتے بہت خوش تھی اور یہ بات  
سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ آیا اگر وہ یہاں ہوتا تو



یہ انجوائے کر سکتی۔ یہ انواع و  
انجام کے پھول پودے یہ خوبصورت پرندے اور  
سب سے دلربا وہ منظر جس سے وہ اس وقت  
محظوظ ہو رہی تھی فوارے کے اوپر کی سب سے  
آخری دھار سے چھوٹی سی مٹی سی چڑیا اڑتے  
ہوئے پانی پینے کی کوشش کر رہی تھی بانی تینوں تو  
نہک کر قریب پڑی لان چیز پر بیٹھ چکی تھیں،  
لیکن وہ وہاں کھڑی تمام خوبصورتیوں کو اپنے اندر  
جذب کر رہی تھی۔ لیکن اچانک ہی تمام منظر پس  
پردہ چلے گئے تھے۔ سرخ روش پر ریگلی گاڑی  
اچانک ہی رکی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنی پوری  
آن بان اور شان کے ساتھ قدم بڑھاتا ان کی  
طرف آ رہا تھا۔ وہ ایک مجسمے کی مانند کھڑی  
ساکت آنکھوں سے اسے اپنی طرف آتا دیکھ رہی  
تھی۔ چونکہ تو اس وقت جب اس نے بالکل  
قریب رک کر سلام کیا تھا۔ وہ اپنی اسی محویت پر  
خود ہی نادم سی ہو گئی۔ وہ اسے بغور دیکھتے آگے  
چلا۔ وہ تینوں اپنی باتوں میں مصروف اسے دیکھ  
پائیں تھیں اس کی آواز پر ایک ساتھ چوکی۔

”ارے بیٹا آگئے تم بہت اچھا کیا۔“ سلمیٰ  
خیم خوشی سے بولیں تھیں لیکن اس وقت ان کی  
خوشی پر اوس پڑ گئی جب وہ رسمی سی علیک سلیک  
کے بعد ان سے فرمائش کرتا آگے بڑھ گیا۔  
”ماما پلیز میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بہت  
تھکن فیل کر رہا ہوں پلیز آپ کافی بنا کر میرے  
کمرے میں بھجوا دیں۔“  
وہاں موجود کسی بھی فرد کو اس سے ایسی  
عقلی اور سرد مہری کی توقع نہ تھی۔ وہ خاموشی  
سے اسے جانا دیتے رہیں۔

”نجانے کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو۔“ سلمیٰ  
حکیم گہری سانس لیتے ہوئے گویا ہوئیں۔  
”کام تو پہلے بھی بہت کرتا تھا لیکن جب  
سے رضیہ چلی گئی ہے بہت آپ سیٹ رہنے لگا

ہے۔“ اس بھی تو بہت ہو گیا تھا اس کے ساتھ،  
لیکن وہ اپنی ہی منوائی تھی کٹھن تکی بن کر رہ گیا تھا  
اس کے سامنے تو مجھ سے تو یہی کہتا ہے کچھ نہیں  
ہوا لیکن میں جانتی ہوں دل ٹوٹ گیا ہے میرے  
بچے کا اور باپ کے سامنے علیحدہ شرمندہ ہوگا۔  
کتنا مان تھا انہیں اس پر کہ یہ اسے یہاں کے  
رنگ میں ڈھال لے گا لیکن افسوس وہ ایسا چاہتی  
ہی نا تھی۔“ ان کے لہجے میں اپنی اولاد کے لئے  
درد سمٹ آیا تھا تو اماں کی آنکھوں میں اپنی اولاد  
کے لئے آنسو اتر آئے۔

راحیلہ نے ریمیل کی جانب دیکھا لیکن اس  
کا چہرہ بے تاثر تھا۔ کیونکہ وہ ان کے سامنے ان  
باتوں کو جھٹلاتی نہ سکتی تھی لیکن اصل حقیقت سے  
ضرور واقف تھی اور یہی بات اس کے اطمینان کی  
باعث تھی۔

”خالہ جان آپ پریشان مت ہوں آپ بہت  
آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ راحیلہ نے انہیں تسلی  
دینا اپنا فرض جانا۔

”ہاں بیٹا دعا کرو ریمیل بیٹا اگر تمہیں  
تکلیف نہ ہو تو پلیز ایک کپ کافی بنا کر اس کے  
کمرے میں دے دو حامد تو بازار گیا ہے تھوڑی  
دیر کے لئے اور مجھ سے اب اتنی سیڑھیاں چڑھی  
نہیں جاتیں ہزار بار کہا ہے اسے کہ نیچے کوئی کمرہ  
منتخب کر لو لیکن مانتا ہی نہیں بہت پسند ہے اسے  
اپنے کمرے کی لوکیشن چھوڑنے پر راضی ہی نہیں  
ہوتا۔“ انہوں نے اسے کہنے کے ساتھ صفائی بھی  
پیش کی تو اسے متذبذب دیکھ کر راحیلہ بول اٹھی۔

”ارے خالہ جان تکلیف کی کیا بات ہے  
اسے کون سا پہاڑ کاٹنا ہے کافی ہی تو بنائی ہے  
دفتر جاتے جاتے اسے خود کافی کی لت پڑ گئی ہے  
اس لئے یہ بہت اچھی کافی بناتی ہے۔“

”احزم کو بھی بہت پسند ہے اچھی بنی ہوئی  
کافی۔“ اور یہ بات وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی



کئی بار تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے کافی پینا کر دے  
چکی اور پہلے پہل تعریف بھی وصول کی تھی۔ کافی  
بنانا اس نے مسز خان سے سیکھا تھا۔ کافی بنانے  
کے بعد تھوڑی سی چھلکتے چھلکتے وہ خود عادی ہو گئی  
تھی۔

”ارے جاؤ ناں ابھی تک کھڑی ہو۔“  
”ہاں بیٹا پلیز بچن کے کینٹ میں تمہیں  
سب کچھ مل جائے گا، مشکل نہیں ہوگی۔“ انہوں  
نے سان سے کہا تو وہ راحیلہ کو مدد طلب نظروں  
سے دیکھتی کوئی راہ فرار نہ پا کر اندر کی طرف بڑھ  
گئی۔

خلاف توقع دستک کی مانوس آواز پر اس  
نے چونک کر آنکھوں پر رکھے بازو کو ہٹا کر  
دروازے کی جانب دیکھا اور اپنے اندازے کی  
درستگی اسے اندر تک منور کر گئی۔ لیکن اس کے  
ساتھ ساتھ اسے حیرت بھی ہوئی۔

”تم یہاں۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔  
”کیوں؟ کیا میں یہاں نہیں آ سکتی؟“ اس  
کے برجستہ سوال پر وہ اٹھ کر اس کے قریب آن  
رکا وہ آج عام دنوں کی بہ نسبت بہت مختلف اور  
خوبصورت لگ رہی تھی شاید اس کی وجہ وہ دوپٹہ تھا  
جو کہ ہمیشہ بہت مضبوطی سے اس کے گرد اور سر پر  
جھا رہا تھا لیکن آج کوشش کے باوجود وہ شانوں  
سے بھی ڈھلکتا جاتا تھا۔

”کیوں نہیں، تم، یہاں آ سکتی ہو۔۔۔۔۔  
اگر۔۔۔۔۔ آنا چاہو تو۔“ اس کی آنکھوں میں جھانکتے  
ہوئے جواب دیا وہ اس کی انگارے کی طرح دکھتی  
سرخ آنکھوں سے نظریں چرا کر پیچھے ہٹی۔  
”میں یہاں خود نہیں آئی خالہ جان نے بھیجا  
ہے مجھے۔“ سائیڈ میبل پر کپ رکھتے اس نے خود  
کو سنبھالا۔

”ہاں، ایک ماں سے بہتر اپنی اولاد کی

خواہش کو کون جان سکتا ہے کہ اسے کس وقت کس  
بات کی ضرورت ہے۔“ وہ مسکرا کر پیچھے ہٹا اور  
بیڈ پر بیٹھ کر اپنے شوز کے تسمے کھولنے لگا۔

”اسلام آباد میں آج ایسی کون سی میٹنگ  
تھی جس میں آپ کا جانا بہت ضروری تھا۔“ آج  
وہ اسے حیران کر رہی تھی اس کے پر شکوہ لہجے پر  
نوراً گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا تو وہ  
اپنی اس بے ساختگی پر خود کو کوسی ادھر ادھر دیکھنے  
لگی۔ اس نے موزے اتار کر بوتلوں میں رکھے  
اور انہیں پاؤں سے دھکیل کر بیڈ کے نیچے کر دیا۔  
بہت ریلیکس موڈ میں بازو پیچھے کی جانب  
لے جا کر ہتھیلیاں بیڈ پر چمائیں۔

”میٹنگ اہم نہیں تھی ”اہم“ تمہارا یہاں  
آنا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید میری موجودگی میں  
تم یہاں آنا پسند نہ کرو۔ اس لئے میں اسلام آباد  
کی میٹنگ میں نہیں بلکہ اسی شہر کے ایک ہوٹل میں  
شفٹ ہو گیا تھا لیکن وہاں جا کر دل کے ساتھ  
ساتھ طبیعت ہی۔۔۔۔۔ ہو گئی سو چلا آیا۔“ اس  
نے بھرپور انگریزی لے کر انگلیاں چٹخائیں۔

”آپ کی کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ اس  
نے فوراً ہی اس کی بات کے اثر کو زائل کرنے  
کے لئے اس کی توجہ دلائی اور باہر کی جانب قدم  
بڑھائے۔

”ایکسیکوزمی، تمہیں تکلیف تو ہوگی لیکن  
ڈریننگ کے دراز میں ٹیلٹس ہوں گی اگر نکال دو  
تو یہ ناچیز بڑا اسمان مند ہوگا۔“ وہ گہری سانس  
لے کر دراز پر جھکی تو دوپٹہ بھی ساتھ ہی ڈھلک  
آیا۔ اس کی پٹی کمر پر بڑی بالوں کی لمبی سادہ سی  
چوٹی بھی ساتھ ہی جھول کر اس کی نظروں کی زد  
میں آ گئی جو کہ آج سے پہلے اس نے بھی نہ  
دیکھی۔

نظروں کی تپش اسے اندر ہی اندر چھلپائے  
دے رہی تھی۔ ٹیلٹس لے کر وہ کسی شاخ کی



بولتے ہوئے اس نے اس کی پشت کی جانب سے اس کے نازک وجود کو اپنی ہاتھوں کے حصار میں لے کر اس کے شانے پر ٹھوڑی ٹکادی۔ ”سر پلیز“ وہ اس کی ہاتھوں میں چھل کر ساکت ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ اس کے وجود کی حدت اور گلون کی مہک اسے خود سے بیگانہ کر دیتی دستک کے آواز انہیں اپنے حواسوں میں لے آئی۔ تڑپ کر مضبوط حصار کو ٹوڑا اور بجلی کی سی تیزی باہر بھاگ گئی۔ آنے والے نے پریشان کھڑے اپنے صاحب کو وہ زریہ نگاہوں سے دیکھا اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

”چھوٹے صاحب! بیگم صاحب آپ کو نیچے بلارہیں ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ اس کے حکم پر وہ اسے بغور دیکھتا باہر نکل گیا۔ وہ ان کا بہت پرانا ملازم تھا اس نے آج تک اپنے مالک کے کردار میں کوئی جھول نہ دیکھا تھا۔ دیکھا تو اس نے آج بھی کچھ نہ تھا لیکن ان کا رویہ انداز اور لڑکی کا اس طرح نکل کر بھاگنا اسے پریشان کر گیا تھا۔ لیکن جلد ہی اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دیا۔

وہ اس کے نکلنے ہی سر تھام کر دھڑام سے بیڈ پر بیٹھا تھا۔

”او مائی گاڈ!“

”یہ کیا ہو گیا؟“

”اوہو میرے خدا، کیوں میں کمزور لمبے کی گرفت میں جا پھنسا؟“

”اب کیا ہو گا؟“

”اُف۔“

”کیا اب وہ کبھی میرا اعتبار کر پائے گی۔“

ندامت اور احساس شرمندگی اسے اندر ہی اندر مسلنے لگی تھی۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر جس کمرے کا

بہار نشینی کی طرح بل کھا کر مڑی تو اس نے اپنی ہاتھوں کو بشار کرتے ایک اور فرمائش جڑی۔ ”پانی بھی پلیز۔“ اس کی نظروں کے ساتھ ساتھ دوپٹے کی بے وفائی کا بھی اثر تھا کہ اس کے ہاتھوں میں لرزش اتر آئی۔ گولیاں اس کی چھل کی نکل کر گلاس اس کی جانب بڑھایا تو وہاں ایک دوسرے سے مس کر گئیں سنسنی کی تیز لہر اس کے سارے وجود میں دوڑ گئی۔ لیکن اگلے لمحے وہ کسی احساس کے تحت چونک اٹھی۔

”آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔“ اس نے بے اختیار ہی اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے فوراً ہی اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ جتنی ہوئی پیشانی پر جب اس نے ہاتھ رکھا روح تک اتر گئی تاثیر مسیحائی کی۔

”کتنا عجیب ہے پروین شاہ کرنے۔“

اس کی بے خودی سے گھبرا کر فوراً اپنا ہاتھ کھینچا۔ اس کی آنکھوں میں پھیلے سرخ ڈوروں کی وجہ سے وہ اب جان پائی تھی۔ بخار کی حدت سے اس کا چہرہ بھی تپا ہوا تھا۔

”مم..... میں خالہ جان کو بتاتی ہوں۔“ وہ تیزی سے مڑی لیکن چند قدم پر ہی اسے جھٹکا لگا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ اس کا آچل تھا مے ہوئے تھا۔

”سر پلیز مجھے جانے دیں۔“ وہ تو پہلے ہی اپنی آج کی کیفیت سے پریشان تھی اور اسے اس کی یہ بے باکیاں مزید اس کے حواس معطل کر رہی تھیں۔ وہ دوپٹے کو ہاتھوں میں لپیٹتا ہوا اس کے قریب چلا آیا۔

”یہ آفس نہیں گھر ہے مسز احزم حسن اور گھر میں، میں احزم کے نام سے پکارا جاتا ہوں۔“ بے خودی کی سی اس کیفیت میں بھی اس نے اس کی ایک بہت پرانی بات کو یاد رکھا تھا۔

”البتہ پیار کرنے والے مجھے از می یا زومی بھی کہتے ہیں۔“ جد بات سے بھرپور لہجے میں



دوازہ کھلانظر آیا اس میں مقید ہو گئی۔ جانتی تھی کہ اس پوزیشن میں کسی کا سامنا نہ کر پائے گی۔ سینے پر ہاتھ رکھے دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ سانوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی وہ رونا چاہتی تھی لیکن آنسو جیسے کہیں اندر ہی جم گئے تھے۔ چار سو ایک سنا تھا جو اسے اپنے وجود میں سرایت کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دیوار سے لگی خالی نظروں سے چاروں اور دیکھ رہی تھی۔ کمرے کی پرکشش آرائش و زیبائش کی بجائے خالی دیواریں اسے اپنے اوپر گرتی محسوس ہو رہی تھیں وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہٹتی ہٹتی چیخوں کو اپنے دل میں اتار گئی۔ نجانے کتنا وقت لگا تھا اسے خود کو سمجھانے

میں۔ ”کہاں رہ گئی تھیں تم ملازم پورے گھر میں ڈھونڈ آیا ہے تمہیں۔“ راحیلہ اسے آتے دیکھ کر فوراً بولی۔

”میں وہ شاید آنٹی کا کمرہ تھا وہ دیکھنے لگ گئی۔“ اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

”اچھا آپ اب ہمیں اجازت دیں رات کافی ہو گئی ہے۔“

”تو رک جاؤ ناں بچیاں پہلی بار میرے گھر آئیں ہیں۔ جی نہیں چاہتا کہ واپس جائیں۔“

”تمہیں آپا ریمیل نے صبح آفس جانا ہے اور شہزاد کا بھی کوئی پتہ نہیں کب چکر لگا لے۔“

”اچھا جیسے تمہاری مرضی۔“

”عادل!“ انہوں نے کہہ کر اپنے ملازم کو آواز دی اور خود بھی اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

”جاؤ احزم سے کہو کہ مہمان جارہے ہیں کم از کم اب تو نیچے آ جائے۔“ انہوں نے ہلکی آواز میں ناراضگی بھرے انداز میں کہا۔

”اور ہاں وہ سارے گفٹ بھی اٹھاتے لانا۔“

”جی بیگم صاحبہ!“

”چھوٹے صاحب! بیگم صاحبہ کہہ رہیں ہیں مہمان جارہے ہیں نیچے آ جائیں۔“

”ٹھیک ہے تم چلو میں آتا ہوں۔“ وہ کہہ کر بالوں میں ہاتھ پھیرتا کھڑا ہو گیا۔

”کیوں نہیں خالہ جان ہم دوبارہ جلدی آئیں گے بلکہ شہزاد کو بھی آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے ان کو بھی ساتھ لاؤں گی۔“

”ہاں کیوں نہیں ضروری۔“ وہ خاموش کھڑی ان کی الوداعی باتیں سن رہی تھی جب سامنے سے اسے آتا دیکھ کر رخ پھیر گئی۔

”لگتا ہے ہمارے کزن صاحب نے تو کچھ زیادہ ٹینشن سوار کر رکھی سے خود پر۔“ راحیلہ نے اسے دیکھ کر چوٹ کی۔

”آئی ایم سوری میں آپ لوگوں کو کمپنی نہیں دے سکا اصل میں میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اچانک۔“ اس نے شرمندہ سے انداز میں نظریں چراتے ہوئے معذرت کی۔ اماں اس کا

کترا یا کترا یا انداز دیکھ کر دل محسوس کر رہ گئیں۔

”راحیلہ بیٹا یہ لو یہ تمہارے لئے۔“ سلکلی بیگم نے پانچ پانچ ہزار کے پانچ نوٹ اس کے ہاتھ میں دیئے۔

”ارے خالہ جان یہ آپ کیا کر رہی ہیں اتنے سارے پیسے۔“ راحیلہ کی آواز پر ریمیل نے بھی ان کی طرف دیکھا اور بے اختیار ہی نظر

ساتھ کھڑے احزم پر جا پڑی ایک لمحے کو نظریں ملیں اس کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھ کر وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔ وہ اس کا سارا پلان سمجھ گئی تھی۔

”تم راشدہ کی ہی نہیں میری بھی بیٹی ہو اور میرے گھر پہلی بار آئی ہو اور بیٹیاں ماں کے گھر سے خالی ہاتھ نہیں جایا کرتیں۔ تم لوگ تو مجھے اتنی

دیر سے ملی ہو کہ میں تو تمہارے کوئی حقوق بھی پورے نہیں کر سکی ابھی تو تمہاری شادی کا قرض



اگر ہے مجھے اور ہاں کسی بھی مشکل میں مجھے  
نہیں بھولنا مجھے فوراً اطلاع دینا اور یہ تمہارا تحفہ

ہے۔" "ہیں کچھ مت کہنا۔" راحیلہ نے جیسے  
بولنے کے لئے منہ کھولا انہوں نے ٹوک دیا۔

"اور یہ راشدہ تمہارے لئے۔"  
"آپا خواہ خواہ تکلف کر رہیں ہیں آپ۔"

ہاں نے اپنا تحفہ تھاما۔  
"اے رہا میری اس ناراض بنی کے لئے۔"

انہوں نے ریمیل کو ساتھ لگاتے ہوئے اسے اس  
کا تحفہ تھمایا۔ وہ ان کی بات پر رسماً بھی کچھ نہ کہہ  
سکی راحیلہ نے چند لمحے انتظار کیا لیکن پر خود ہی

بول اٹھی۔  
"ارے نہیں خالہ جان ناراض کیوں ہوگی  
آپ سے۔"

"بس نجانے کیوں یہ مجھ سے الگ تھلگ  
سے کترائی کترائی سی رہتی ہے حالانکہ نہیں جانتی

کہ یہ مجھے کتنی عزیز۔" انہوں نے محبت سے اس کا  
ہاتھ تھاما۔

"خوش رہا کرو بیٹا تمہاری عمر کی لڑکیاں تو  
بہت چیخل ہوتیں ہیں اور ایک تم ہو کہ اتنی خاموش

خدا سب کچھ بہتر کرے گا اس طرح سوچوں میں  
گم مت رہا کرو۔" وہ ان کی اتنی محبت پر چاہنے

کے باوجود بھی ایک لفظ نہ بول سکی۔  
"دعا کرنا آپا خدا میری بیٹی کے نصیب میں

سکھ لکھ دے۔"  
"آمین۔" انہوں نے کہا۔ وہ مسلسل اس

پر نظریں جمائے ہوئے تھا جب کہ وہ مستقل سر  
جھکائے اس کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھی۔

"آپ کب ہمارے ہاں تشریف لا رہے  
ہیں؟" راحیلہ نے ایک بار پھر اسے طنز بھری

نظروں سے دیکھا۔ اس کا رویہ انداز اسے بالکل  
بھی پسند نہ آیا تھا۔ اس کی پر سنائی کو تو وہ سراہے

بنا نہ رہ سکی تھی لیکن جو کچھ اس نے ایک کزن  
ہونے کے ساتھ ساتھ اس تعلق کے حوالے سے

سوچ ڈالا تھا۔ وہ اس معیار پر پورا اترتا دکھائی نہ  
دیا اور پھر جو کچھ ان کے بارے میں سنا تھا وہ اس

کے مزاج میں کہیں نظر نہ آیا تھا۔ وہ اس کے سوال  
پا محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

اس کا یہ حوصلہ شکن رویہ اہل کو جانتے  
بو جھٹتے بھی دہلائے دے رہا اب ان سے مزید

کھڑے رہتا مشکل تھا۔  
"عادل ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے اور یہ

سب چیزیں گاڑی میں رکھو۔" سہلی آئی اسے ایک  
بار پھر ان سے اجازت طلب کرنے پر مجبور دیا۔ وہ

کوشش کے باوجود اس سے کوئی بات نہ کر سکا۔  
ان کے جانے کے بعد ماما نے اسے آڑے

ہاتھوں لیا لیکن پھر اس کی طبیعت دیکھ کر نرم ہو  
گئیں۔ وہ ساری رات سوچتا بخار میں پھنستا رہا

احساس جرم میں مبتلا ایک پل بھی نہ سو پایا تھا۔  
اگلی صبح سہلی بیگم اس کی حالت دیکھ کر دل نہیں

تھک سکی لیکن وہ اسی حالت میں آفس جانا چاہتا تھا  
لیکن انہوں نے اس کی ایک نہ چٹنے دی تو اس

نے ریسور اٹھایا۔  
"ہاں حامد مسز خان کے کمرے سے پتہ

کرو مس ریمیل آئیں ہیں تو مجھے فوراً کال ایک  
کرو۔" پھر اس انتظار کی گھڑیاں اس کے لئے

بہت طویل ہو گئیں تھیں۔ بیل پر جلدی سے ریسور  
اٹھایا۔

"نوسر وہ تو نہیں آئیں ابھی تک۔"  
"ٹھیک ہے وہ جیسے ہی آئیں مجھے انفارم

کرنا۔" اس نے کہتے ہوئے ریسور رکھ کر بیڈ  
کراؤن پر سر ٹکا دیا۔ لیکن اس دن کے ساتھ

ساتھ اگلا دن بھی انتظار کی نذر ہو گیا۔ تیسرے  
دن وہ ہلکے سے بخار اور کمزوری کے باوجود آفس

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل

چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل  
چلا آیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ٹیبل



ایک خاکی لٹاؤ بیچ چکا تھا۔ جسے بیٹے نے پہلے ہی اسے چاک کیا۔ اس کا یہ ریگڑ بیٹے اس کی توقع کے عین مطابق لیکن وہ پھر بھی بیٹے پر ڈھمکے گیا۔ ایک ہاتھ میں کاغذ اور دوسرے میں سر کو تھاما بیٹھا تھا۔

وہ جب پہلی بار اسے ملی تو عام لڑکیوں کی طرح بہت عام سی لگی تھی۔ کوئی ایسی خاص بات تو تھی نہیں اس میں کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ بالکل سادہ سی لیکن قدرے مختلف و منفرد لڑکی جب بھی اس کے سامنے آئی ایک لمحے کے لئے ہی کسی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا اور پھر بہت اچانک ہی اس عام سی لڑکی کو اس کی زندگی میں ایک بہت خاص مقام حاصل ہو گیا۔ وہ مقام جو آج تک کسی بھی انسان کو حاصل نہ ہو سکا تھا۔ اس کی فرسٹ کزن ہونے کا مقام وہ جو رشتوں کے لئے ترسا ہوا تھا۔ اپنے فرینڈز کے ماموں چاچو پھوپھو خالہ کی پائیں کزنز کی آپس کی دوستی اور شرارتوں کے قصے اسے بہت انساں کرتے تھے۔ کوئی دوسرا بہن بھائی بھی نہیں تھا۔

ماما، پاپا اور بس، اور پھر ماما نے اسے یہاں پاکستان آنے سے پہلے بتایا ان لوگوں کے متعلق جو اس کے اپنے تھے۔ اس کی رگوں میں اپنے وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس لئے وہ زیادہ تر پاکستان میں رہنے کو ترجیح دیتا اور کچھ ماما کی اداسی کو دیکھتے ہوئے اس نے پاکستان میں ہی پرنس شروع کرنے اور گھر بنوانے کی اولیت دی تھی۔ انہوں کو پالینے کی ایک جتنو ایک لگن تھی جو پل پل کر وٹ بدلتی تھی لیکن ماما ڈریس بتانے پر راضی نہ تھیں۔ پھر اس کی زندگی بہت مصروف ہو گئی لیکن تھوڑی سی فراغت اسے اس مقام پر سے آئی جہاں وہ دنگ کھڑا رہ گیا۔

”منزل اس کے اتنے قریب تھی اور وہ اتنا عرصہ لا عمل رہا۔“

اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ لیکن دوسری طرف اجنبیت و بیگانگی کی دیوار برستور قائم تھی۔ کبھی نہ گرنے کے لئے وہ پورے غلوں کے ساتھ بڑھا تھا لیکن وہاں نو وینسی کا بہت بڑا انداز آدمی اس تھا۔ وہ سوچتا اور کڑھتا رہتا اس لئے ہر طور کوشش کی تھی اس کا ہر انداز بیگانوں والا تھا۔ اس کے باوجود اپنے دل میں اس کے لئے اپنائیت کا جذبہ محسوس کرتا تھا اور شاید بالکل غیر محسوس انداز میں یہ جذبہ اپنائیت کسی اور ہی سر پر گامزن تھا۔ اس سے پہلے کہ اس پر کوئی انکشاف ہوتا قسمت خود بخود اسے لئے اس کے در پر چلی آئی۔ بنا سوچے سمجھے ہی اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ یہ حقیقت تو اس پر بہت بعد میں آشکار ہوئی کہ یہ اس کا نہیں بلکہ اس کے دل کا فیصلہ اور دل کا فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر کرنے کا سوچتا تو وہ ادھم مچانے لگا اور آخر کار اس نے ناکام ہو کر ہتھیار ڈال دیئے۔

اسی سے بہت آگے اس کے ہاتھ سے کاغذ کھینچ لیا وہ چونک کر سیدھا ہوا تھا۔

”ایسا تو ہونا ہی تھا ایک نہ ایک دن۔“ مسرز خان نے پڑھ کر گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا اور اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”پریشان ہو۔“ ان کے پوچھنے پر اس نے لب سکڑے اور پھر سر پرشت سے ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

”تم آخر ایک فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے۔“

”بہت عرصہ ہوا فیصلہ تو ہو چکا تھا۔“

”ہونہ، فیصلہ، ایسے فیصلے کبھی نہیں کرنے چاہیے جس میں دل راضی نہ ہو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے دل کی مرضی کے خلاف جانے پر۔“ دیکھو

احزم، رضیہ جنید تمہارا مزاج نہیں ہے جب کہ ریمیل تمہارا اندر ہے۔ اپنی زندگی کا اختیار کسی کو



”تو کیا اسے معلوم ہے۔“  
 ”جی ہاں تقریباً پچھلے تین سالوں سے۔“  
 ”کیا۔“ یہ انکشاف پہلے سے بھی زیادہ  
 حیرت انگیز تھا ان کے لئے۔  
 ”اور تمہیں اب معلوم ہوا ہے۔“  
 ”جی نہیں ایک ساتھ۔“ پھر وہ انہیں تفصیل  
 بتانے لگا۔

”اچھا سمجھی وہ ان دنوں اس قدر مریض ہو  
 کر رہی تھی۔ پریشان رہتی تھی نہیں دیکھ کر گھبرانا  
 اور تمہارا سامنا کرنے سے کترانی تھی۔“ وہ ان  
 کی بات پر ہنسا۔

”جی نہیں جس وقت کی آپ بات کر رہی  
 ہیں اس وقت تو اس شناسائی کو تقریباً ایک سال  
 سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔“  
 ”تو پھر۔“ ان کے لہجہ میں استعجاب تھا۔  
 ”ان دنوں تو۔۔۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک  
 گیا۔

”پھر کسی وقت بتاؤں گا بھی تو فی الحال  
 آپ یہ رگڑیشن پر سائن کر کے ایلمنٹریٹک  
 پیچائیل اس نے کاغذ پر اپنے سائن کرتے  
 ہوئے کہا۔“ تو انہیں حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

”تو کیا تم یہ اسلٹیفی منظور کر رہے ہو۔“  
 ”تو اس کے علاوہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“  
 ”تم ایسا نہیں کر سکتے تم بھول رہے ہو کہ  
 پانچ سالہ ایگریمنٹ ہے ہمارا اس کے ساتھ۔“  
 ”اوہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ تو پھر ایسا  
 کریں کہ اپنی طرف سے اس کی چھٹی لکھ دیں کچھ  
 عرصے کے لئے۔“  
 ”او کے یہ ٹھیک ہے۔“

”ریمیل کیا بات ہے کیوں کھوئی کھوئی  
 رہنے لگی ہو، ہر وقت خاموش آخر تم بتائی کیوں  
 نہیں کہ اس دن تمہاری احزم سے کیا بات ہوئی

مست وہ ہیں یہ نہیں کہتی کہ ماں باپ کی مرضی کے  
 خلاف کرو لیکن انہیں قابل تو کر سکتے ہوتاں۔“ وہ  
 غلاف کر دیا مسکرا کر سیدھا ہوا۔

ان کی باتوں پر ختم ہو چکا مسرز خان  
 ”رضیہ جنید کا قصہ تو ختم ہو چکا مسرز خان  
 اور ریمل تو اس کی حد سے بڑھتی ہوئی خود  
 داری اور کھوئی انا میرے ساتھ ساتھ شاید اس کو  
 بھی جاہ کر رہی ہے۔“

انا پرست سہی پھر بھی ایک لڑکی ہے  
 وہ چاہے جانے کی خواہش میں مر رہی ہوگی  
 وہ چاہے ”تم شاید عورت کی نفسیات کو کبھی نہ سمجھ  
 سکو۔“ مسرز خان نے خوبصورت انداز میں شعر  
 پڑھ کر اس سے کہا۔

”مسرز خان آپ جانتی ہیں ریمل کون  
 ہے؟“ وہ اس کے سوال پر کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔  
 ”دو دن کی جدائی نے ہی تمہاری ذہنی رو  
 بہکا دی ہے۔“

”میں سیریس ہوں مسرز خان۔“

”ہوں، ریمل تمہاری ایک بہت اچھی ورکر  
 ہے۔“ ”تھی۔“ اس نے صبح کی اور ساتھ ہی  
 پوچھا۔

”اس کے علاوہ۔“  
 ”س کے علاوہ وہ ایک پر خلوص سادہ دل  
 اور بہت اچھی لڑکی ہے۔“  
 ”اور اس کے علاوہ وہ میری فرسٹ کزن  
 بھی ہے۔“

”واٹ۔“ وہ اس انکشاف پر وہ ایک دم  
 ہی کرسی پر سیدھی ہو بیٹھیں۔

”کیا سچ کہہ رہے ہو تم۔“  
 ”جی! میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ  
 میرے ننھیالی رشتہ دار ماما سے ناراض ہیں۔“  
 ”ہاں تو کیا ریمل تمہاری۔“  
 ”میری خالہ زاد ہے۔“



تھی۔ میں تو بہت پریشان ہوں اس کا رویہ دیکھتے ہوئے لگتا ہے بہت جلد وہ کوئی نہ کوئی فیصلہ کر دے گا۔“ آپ کے بولنے پر اس نے خاموش نگاہوں نے ان کی جانب دیکھا۔  
”کیا بات ہے کن سوچوں میں گم رہنے لگی ہو، آفس بھی نہیں جا رہی ہوا تھے دنوں سے۔“  
”میں نے ریزائن کر دیا ہے۔“

”کیا؟“  
”لیکن کیوں۔“ اس نے ناقابل یقین حیرت سے اسے دیکھا وہ کم از کم اس سے اس بات کی توقع کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حالات کس سطح پر تھے چند دنوں بعد انہیں اچھے خاصے خرچے سے دوچار ہونا تھا۔ سلمیٰ بیگم کے دیئے گئے پچیس ہزار پر ہی قناعت کر کے نہیں بیٹھنا تھا انہیں۔

”بس تھک گئی ہوں میں آرام کرنا چاہتی ہوں کچھ دن۔“ تھکے تھکے انداز پر وہ بالکل خاموش ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگیں اور پھر گہری سانس لیتی وہاں سے اٹھ گئی صرف اپنے لئے تو وہ اب اسے مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

جوں جوں دن قریب آرہے تھے آپ کے چہرے کی پریشانی اور پڑمردگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جس کے باعث بی بی شوٹ کر جاتا۔

”آپ کیوں اتنی تینشن لے رہی ہیں انشا اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تمہیں نہیں معلوم ریمیل جانتی ہو یہاں آنے سے پہلے امی نے کہا تھا کہ اگر بیٹا نہ ہوا تو اس گھر میں واپس قدم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”ریمیل اگر بیٹا نہ ہوا بیٹی ہوئی تو؟“  
”کچھ نہیں ہوگا آپ انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ نے الٹرا ساؤنڈ نہیں کروایا۔“  
”ڈاکٹر نے کہا تھا میں نے نہیں پوچھا۔“

”میں..... میں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتی ریمیل بس خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھ سے میری خوشیاں نہ چھینے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور اندر آتی اماں وہی سے ہی لوٹ گئیں۔

”یا اللہ کیا ایک دفعہ پھر وہی کہانی دہرائی جائے گی، کیا میری بیٹی کی قسمت میں بھی وہی نارسائی کا کرب لکھا ہے۔ جسے آج تک میں بھل رہی ہوں۔ یا اللہ تو نے مجھے زندگی میں کوئی سکھ نہیں دیا پھر بھی میں نے بھی تجھ سے گلہ نہیں کیا ہمیشہ تیری رضا میں راضی ہی میرے پروردگار۔“  
”لیکن میری بچی کو اس غم سے دوچار نہ کرنا میرے مولا۔ تو، تو بہت کارساز ہے تیری خدائی میں تو کسی چیز کی کمی نہیں میرے مالک تو اس کا دامن خوشیوں سے بھر دے۔“ وہ سجدے میں گری مسلسل گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھیں اور ذہن کی سکریں پر ان کا ماضی ان کے سارے رنجوں سے کھرٹکڑا کر رہا تھا۔

وہ اپنے ماں باپ کی دو ہی بیٹیاں تھیں بابا نے کم آمدنی کے باوجود ان کے سارے لاڈ اٹھائے تھے۔ سلمیٰ آپا شروع سے ہی بہت قابل اور ذہین تھیں اور پڑھنے کا شوق تھا تو بابا کو پڑھانے کا لیکن یہ شوق اس وقت دم توڑ گیا جب ان کے قدم ان کی عزت کو روندتے ہوئے گھر کی دہلیز پار کر گئے (آپا بی اے آنرز کر چکی تھیں وہ ان سے پانچ سال چھوٹی تھیں اور ابھی میٹرک بھی نہ کیا تھا) بابا کی کمر ٹوٹ گئی اور ماں لاڈلی بیٹی کی جدائی میں چل بسی انہیں تو ان کی مری ماں کی خبر بھی نہ دی گئی تھی۔ وہ اس وقت پہنچی جب لوگ انہیں منوں مٹی تلے دفن کرنے واپس آچکے تھے۔ وہ بہت روئی تڑپی لیکن بابا کا دل نہ پیسجا اور نہ ہی گھر کی دہلیز پار کرنے کی اجازت دی گئی



غور کریں اور دھکے دے کر وہاں سے نکال دیا۔  
پورا سال انہوں نے معافی کی طلب میں اس در  
دھکے کھائے تھے لیکن بابا نے معاف کرنا تو  
درگزر ان کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ حسن  
جانی ان کی حالت کے پیش نظر انہیں جلد ہی  
پاکستان سے یاہر لے گئے اور وہ جو کبھی کبھار ان  
کی شکل نظر آتی ان سے بھی گئی۔

بابا نے اسے بھی میٹرک سے پہلے ہی اٹھا  
لیا۔ پڑھنے کا شوق تھا اس لئے باپ کی منت  
ساجت کی لیکن انہوں نے ماننے کی بجائے بہت  
جلد ان کی شادی کر دی۔ شادی کیا ہوئی تھی جسے  
جہنم کا کوئی دروازہ ان پر کھل گیا۔ چار دیوڑ اور  
پانچ نندیں تھیں۔ دیوڑ چھوٹے تھے دو نندیں  
بیابانی لیکن اسی محلے کے دو چار گھر چھوڑ کر رہتی  
دونوں نے اپنی سسرال چھوڑ کر یہاں مکان  
کرائے پر لے رکھے تھے بیابانی تو تیسری بھی تھی  
لیکن وہ اپنے دو بچوں کو چھوڑ کر طلاق لے کر  
واپس میکے آئی تھی۔ افتخار شروع سے کانوں کے

کچے تھے۔ جو بڑھا دیا پڑھ لیتے۔ بہن کا کیا انہیں  
ساری زندگی جھگڑنا پڑا تھا معمولی سے چوک بھی  
ان کے لئے طعنہ بن جاتی۔ شادی کے پہلے ہی  
سال بیٹی پیدا ہوئی تو سب نے ان کا جینا حرام کر  
دیا۔ ساس نے طعنہ دیتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ  
وہ خود بھی تو پانچ بیٹیوں کی ماں ہے۔ دوسرے  
سال بیٹا پیدا ہوا تھا لیکن وہ دنیا میں آنے سے  
پہلے ہی دم توڑ گیا۔ بہت زیادہ کمزوری نامناسب  
دیکھ بھال اور نیند کی کمی نے انہیں یہ دن دکھایا  
تھا۔ وہ لیٹی چھت کو گھورتی رہ گئیں۔

”اب لیٹی کس کا انتظار کر رہی ہے، تو، تو  
ایسی منحوس ہے کہ خدا بھی تجھ پر اپنی رحمت نہیں  
کرتا تو اس قابل ہی نہیں کہ بیٹے کی ماں بنے۔  
چل اٹھ دفع ہو چکن میں ڈھیر لگا ہے برتنوں کا جا  
کر صاف کر انہیں۔“

ایک صبح ہی تو پہاڑ جیسا غم سہا تھا انہوں نے  
لیکن یہ حکم بجا آنا بھی ضروری تھا۔ تیسری بار بھی  
زندگی کی نوید ملی تو چوتھے مہینے میں بھی دم توڑ گئی۔  
وہ خود بھی تو موت کے منہ سے واپس آئیں  
تھیں۔ پراچیلہ کو بھی وہ توجہ نہیں مل رہی تھی جس کی  
وہ حقدار تھیں۔ دو سال کی ہو چکی تھیں لیکن نہ تو وہ بولنا  
سیکھی تھی اور نہ ہی ٹھیک طرح سے چلنا۔ بس ڈری  
سہی سی ایک کونے میں بیٹھی رہتی یا پھر جب ماں  
نظر آتی تو ریں ریں کرتی گرتی پڑتی اس کے  
چچھے پپتی۔ لیکن ان کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا  
کہ وہ اسے اٹھائیں یا وقت پر کھانا ہی کھلا دیں۔  
جیسے ہی وہ اپنی توجہ اس کی طرف کرتیں اسی وقت  
ساس نندوں کو کوئی نہ کوئی کام یاد آ جاتا۔ ڈاکٹر  
نے دوبارہ اتنی جلدی بچہ پیدا کرنے سے منع کیا  
تھا۔ لیکن ساس کو پوتا چاہیے تھا۔  
ساس نے فوراً گھر سے نکل جانے کا حکم  
صادر کر دیا۔

”بیٹا ہوا تو اس گھر میں دوبارہ قدم رکھنا  
ورنہ اپنی منحوس شکل لے کر یہاں نہ آؤ۔“ اور شاید  
خدا کو بھی اس کی بربادی ہی منظور تھی۔ کہ اس نے  
ایک دفعہ پھر بیٹی سے ہی اس کی گود بھری تھی۔ ان  
لوگوں کو خبر ہوئی تو اس پر ہمیشہ کے لئے ان پر گھر  
کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ وہ مہر شکر کر کے  
بابا کے زیر سایہ رہ کر اپنی بچیوں کی پرورش کرنے  
لگی۔

ریمل اس وقت چھ ماہ کی تھی جب محلے کے  
ایک گھر میں آیا کانوں آیا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں  
ان کا بیٹا چھ سال کا ہو چکا تھا۔ کتنی دیر تک باتیں  
کی تھیں انہوں نے ان کے ساتھ جو ہوا انہوں  
نے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا اس لئے  
انہیں آپا سے کوئی شکایت نہ تھی۔ انہوں نے ایک  
خاص ہدایت کی تھی انہیں کہ اپنی بیٹیوں کی پرورش  
میں کسی کی بات نہ ماننا انہیں خوب سارا پڑھانا



لکھانا جو کرنا چاہیں انہیں مت روکنا اور جب بھی میری ضرورت پڑے مجھے آواز ضرور دینا۔ لیکن اس کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہ ہوا۔ البتہ انہوں نے واقعی ہی اپنی بیٹیوں کی پرورش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ دونوں بچیاں بھی خاصی حساس تھیں البتہ حساسیت کا انداز مختلف تھا۔ راحیلہ نے انٹر کے بعد پڑھنے سے انکار کر دیا کہ نانا پر پڑھائی کا بہت بوجھ تھا اور ریمیل نے تو آٹھویں کلاس سے ہی ہر ممکنہ حد تک اپنا خرچ خود اٹھایا تھا۔ وہ تو جدوجہد زندگی میں شوہر کے کردار کو بالکل بھول ہی چکی تھیں کہ وہ ایک دن پھر چلا آیا۔ ان کی محبت میں نہیں بلکہ نشے کی محبت میں اس کی ماں بہنوں نے اس کا گھر تو برباد کیا ہی تھا لیکن اسے برباد کرنے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

اماں تو سجدہ شکر بجالاتے نہ تھکتی تھیں۔ خدا نے بہت بڑی رحمت کی تھی ان پر۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق آپنی کو قبل از وقت ہی ہسپتال ایڈمٹ کروا دیا تھا۔ دو دن بعد آپریشن کی تمام تیاری مکمل تھی کہ اللہ نے دھڑا دھڑا اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دیئے۔ پورے وارڈ میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ مبارک سلامت کے شور کی گونج بڑی دیر تک کوریڈوروں میں گونجتی رہ گئی تھی۔ بیٹے کی خبر پاتے ہی آپنی دوبارہ جی اٹھیں تھیں انہیں اسی دن ڈسچارج کر دیا گیا۔ شہزاد بھائی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ ان کی ماں نے تو جیسے ہی ڈیرے ڈال لئے تھے اس لئے دیوروں کے لئے رستہ کھل گیا۔ اس وقت بھی کمریے میں اچھا خاصہ راش تھا۔ نند محترمہ بمع فیملی موجود تھیں۔

ان کے ہر دکھ سوکھ میں شریک رہنے والی بوڑھی خالہ رشیدن جو کو خاصی منہ پھٹ اور صاف گو مشہور تھیں وہ بھی دن میں دو چار چکر ضرور لگا

لیتی تھی اس وقت بھی موجود تھی۔

”آپا نے کی پھپھو آئی ہے بنا دیکھنے۔ لے بھی منے آج تو تیرے وارے ہمارے ہو گئے پھپھو تو جھولیاں بھر بھر کے دے گی۔ ڈھیروں ڈھیر تحفے ملیں گے آج تجھے۔“ انہوں نے منے کو نہلا دھلا کر پوڈر لگا کر کپڑے پہنائے تھے ابھی ابھی۔ خالہ رشیدن نے غیر محسوس سا طنز کیا تو اماں نے جلدی سے ان کا بازو دبایا۔ پھپھو نے بڑھ کر جھٹکا اٹھالیا۔

”ہاں تو دوں گی ناں جھولیاں بھر بھر دعائیں اور رہی بات تحفوں کی تو وہ اب مجھے لینے ہیں میرا حق بنتا ہے پوری لسٹ بنا کر لائی ہوں تجھے ناک نہیں کٹوانی سسرال میں۔“ اس کی بات پر خالہ رشیدن ناک پر انگلی رکھے حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”اے لے لڑکی کیسی باتیں کر رہی ہے تو، کیا خالی اتھ جھٹکا دیکھتے ہوئے شرم نہ آئے گی تجھے۔“

”بس بس بی بی بہت ہو گیا، تم کون ہوتی ہو ہمارے معاملات میں ٹانگ اڑانے والی، دینا ہم نے یا تو نے۔“ منے کی دادی فوراً بیٹی کی حمایت میں بولی تھی۔

”آئے ہائے عورت کیا کسی نے تمیز نہیں سیکھائی تجھے پڑوں سے بات کرنے کی۔“ ان کی ٹکڑا رہا جاری تھی کہ وہ چائے بنانے کچن میں چلی آئی۔ شاید زبیر نے اسے وہاں سے اٹھتے دیکھ لیا تھا اس لئے وہ بھی آہستگی سے اٹھ کر اس کے پیچھے چلا آیا۔

”سنا ہے لوگوں نے چپکے چپکے ہی منگنیاں کروا رکھیں ہیں اور ہمیں ہوا بھی نہ لگنے دی، چلیں اچھا خیر ہمیں منگنی کی انگوٹھی ہی دکھا دیں۔“ ”میں اپنے ذاتی معاملات میں مداخلت پسند نہیں کرتی پلےز آپ اندر جا کر بیٹھیں تو زیادہ



ہے اور راحیلہ اب تم کچھ نہیں بولوگی۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے میرا بس نہیں چننا کہ میں اپنی بچیوں کے لئے کیا کروں۔

”ارے ہاں ایک خوشخبری سنائیں تمہیں۔ حسن انشا اللہ بہت جلد پاکستان آرہے ہیں۔“

”اچھا بھائی صاحب آرہے ہیں۔“ ان کی مشکور سوچی ہوئی آواز ابھری۔

”ہاں اس لئے اب میں جلدی نہیں آسکوں گی گھر کو نئے سرے سے ڈیکور میٹ کرنا اور بھی بہت سے کام نمٹانے ہیں لیکن جب وہ آجائیں گے تو تم سب کو انوائٹ کروں گی۔“ وہ خوش خوشی پتار رہی تھی لیکن اماں کو نچانے کن سوچوں میں گم تھیں کہ وہ رسا بھی نہ مسکرائیں۔

خدا خدا کر مہمانوں کا آنا جانا کچھ کم ہوا تو اس پورے گھر کو نئے سرے سے دھو کر اچھی طرح صفائی کی۔ ارحم کو پہلا انجکشن لگوانا تھا اور آپنی کے بھی کچھ ٹیسٹ تھے جو کہ کلین کر دانا تھے اس لئے اماں انہیں لے کر ہسپتال گئیں۔ گھر کے تمام کاموں سے فارغ ہو کر اس نے آپا کے لئے سوپ تیار کیا۔ گھر کا حلیہ سنوارتے سنوارتے اس کا اپنا بگڑ چکا تھا سو نور آبی ہاتھ روم میں مٹھ گئی۔

باہر نکلی تو، تو لیے میں لیٹے بالوں کو کھول کر رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور تولیہ صحن کی تار پر پھیلا کر کمرے میں چلی آئی۔ کمپیوٹر آن تھا جس پر ان کی پسندیدہ گلوکارہ کی آواز مدھم سروں میں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ پر لیس شدہ دوپٹہ بیڈ پر پھیلا تھا وہ مطمئن انداز میں بھی بھیکے بالوں میں برش کرنے لگی۔

میں تیرے سنگ کیسے چلو بچنا تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا گانوں کے بولوں پر اس ہاتھ بڑھا کر بالکل مدھم آواز کو تھوڑا سا اونچا کیا۔ ہونٹوں پر ہونٹ جمائے پوری سنجیدگی سے گانے کے بولوں

”سب ہے۔“ ”اوہ تو آپ کو ہمارا یہاں کھڑا ہونا سب لگ رہا ہے، تو جب خود آپ آفس کے سامنے مردوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہیں تو کیا وہ بات ہے۔“ اسے غصہ تو بہت آیا لیکن راحیلہ کی سسرال کے تاملے وہ اس کے منہ لگتا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے خاموشی سے پلیٹوں میں سبٹ نمکو اور مٹھائی وغیرہ رکھنے لگی۔ وہ کوئی جواب نہ ملنے پر بھی ڈھیوں کی طرح وہاں کھڑا اسے ٹھوکتا رہا۔

”اے لڑکے تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔“ خالد رشیدن اپنی پاٹ دار آواز میں اس کے کان کے قریب چلا میں جس طرح ڈر کر وہ اچھلا تھا وہ رخ پھیر کر مسکرا دی۔ خیالہ اسے بہت پیار کرتی تھیں۔ اس لئے جانتی تھی کہ وہ کوئی غلط مطلب نہیں نکالیں گی۔ اس نے ان کے ہاتھ ہی چائے کی ٹرے اندر بھجوائی اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

راحیلہ کے بیٹے کی ولادت کے بعد سلمیٰ بیگم نے کئی چکر لگائے تھے۔ منے کے لئے ڈھیروں ڈھیر تحائف اور کپڑوں کے ساتھ ساتھ نہ صرف راحیلہ کے سوٹ بلکہ شہزاد اور اس کی ساس نند کے کپڑے بھی شامل تھے۔ راحیلہ کے لئے خوبصورت سا گولڈ کا سیٹ اور اس کی ساس کے جھمکے انہیں حیرت میں ڈال گئے تھے۔

”خیالہ جان ان سب چیزوں کی کیا ضرورت تھی۔“ راحیلہ نے تقریباً رو دینے والے انداز میں کہا۔

”ہاں آپا اتنا سب کچھ کیوں بوجھ بڑھاتی ہو میرا اتنا شرمندہ نہ کیا کرو مجھے۔“

”تم خاموش رہو راشدہ یہ میرا اور میری بیٹی کا معاملہ ہے۔ مائیں تو بیٹیوں کو جتنا بھی دیں کم



پر غور کر رہی گانا ختم ہوا تو پرش رکھ کر جیسے ہی پلٹی۔  
 اپنی جگہ بالکل ساکت رہ گئی وہ نجانے کب سے  
 چوکھٹ کے بیچ و بیچ کھڑا اس کی تمام کاروائی  
 ملاحظہ کر رہا تھا کہ اس کے پلٹنے پر چونکا۔  
 ”آئی ایم سوری۔“ بیرونی دروازہ کھلا تھا  
 میں نے دو ایک بار تاک کیا لیکن کوئی جواب نہ آیا  
 تو فوری اندر چلا آیا۔ اس نے کندھے جھٹکتے  
 ہوئے شرمندہ سے انداز میں وضاحت کی تو اسے  
 یاد آیا کہ نہانے سے پہلے رشیدن خالیہ کو سبزی  
 لانے کے لئے پیسے دینے کے لئے گئی تھی واپسی  
 پر دروازہ کی کنڈی اس خیال سے نہیں لگائی کہ  
 جب وہ آئیں تو انہیں مشکل نہ ہو۔ اس کی سمجھ  
 میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے وہ جس حلیے میں اس  
 کے سامنے کھڑی تھی شرم و خفت سے اسی اچانک  
 افشار پر حواس ہو گئی۔ پہلا گانا ختم ہونے کے بعد  
 دوسرا لگ چکا تھا۔

زندگی کے سفر میں اس لئے تھا تم آپ جیسا میں مہمان کیا  
 سب سے پہلے بیڈ پر پھیلا دو بیڈ بیچ کر  
 شانوں پر پھیلا اور ساتھ ہی کمپیوٹر کا سوچ بیچ کر  
 نور جہاں کی آواز کا گلا گھونٹا۔ ڈھلکتے دوپٹے کو سر  
 پر رکھا تو وہ احتیاجاً دوسرے شانے سے پھسلنے لگا  
 جسے اس نے مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کی بدحواسی  
 پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رنگ گئی۔ اس  
 وقت اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ انتہائی  
 پر اعتماد اور ہر روز سیکڑوں نت نئے چہروں کو ڈیل  
 کرنے والی ورکنگ گرل ہے۔

”آپ کے ہاں مہمانوں کو بیٹھنے کے لئے  
 نہیں کہتے کیا، یا میرا آپ پسند نہیں آیا؟“

”اے، وہ نہیں، آئیے باہر بیٹھتے ہیں۔“ وہ  
 شاید ابھی بھی سنبھل نہ پائی تھی اس لئے ہناسو جے  
 سمجھے کہہ گئی اور چند قدم بڑھا کر قریب چلی آئی  
 لیکن وہ ابھی تک دروازے میں جما کھڑا تھا۔

”ہاں شاید اب میں آپ کے اعتبار پر پورا

نہیں اترتا۔ آپ کی نظر میں نظر میں ناقابل اعتبار  
 ہو گیا ہوں۔“ اس کے چہرے پر نظر میں جھانک  
 بولا تو وہ گہری سانس لے کر پیچھے ہٹ گئی۔  
 ”تشریف رکھیے۔“ اس نے کمرے میں

رکھی واحد کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا  
 وہ اس عزت افزائی پر حوصلہ پاتے ہوئے آگے  
 بڑھا کرسی پر بیٹھ کر ساتھ ہی رکھی کمپیوٹر ٹیبل پر  
 ہاتھ میں پکڑے گلاسز اور موبائل رکھ دیئے۔  
 ”باقی لوگ کہاں ہیں۔“

”ہا سپیٹل گئے ہیں۔“

”کیوں خیریت۔“ اس کے پوچھنے پر اس

نے تفصیل بتائی۔

”کیا لیں گے آپ چائے یا.....“

”بیٹھ جاؤ ابھی مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔“

وہ جلد از جلد اس کے سامنے سے ہٹ کر اپنے

آبشاروں کی طرح بے قابو ہوتے سلکی بالوں کو

باندھنا چاہتی تھی۔ لب دانٹوں تلے دبا کر سامنے

بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ہاتھوں کی لرزش اور چہرے پر

چھائی ہیرا ہٹ اس کے اچھے خاصے نروس ہونے

کی نشاندہی کر رہے تھے۔ اس نے آج سے پہلے

بھی اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے ان

گھنے سیاہ لمبے بالوں کو ایک بڑے سے بینڈ میں

لپیٹے رکھتی تھی اور دوپٹے کو قابو کرنے کے لئے سیٹنی

پنوں کا سہارا لیتی تھی۔ اس نے بھی تصور میں بھی

نہ سوچا تھا کہ ان کے بال اتنے خوبصورت ہوں

گے جنہیں اب وہ اس کے سامنے بیٹھی بار بار

آگے آ جانے پر کان کے پیچھے اڑتی تھی۔ وہ بہت

خاموش سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“ اور پھر شاید اس کی توجہ خود

پر سے ہٹانے کے لئے اس نے پوچھا تھا۔

”آفس میں سب کیسے ہیں؟“

”تمہیں اس سے کیا تم نے تو ریزائن کر دیا



ہاں۔ ریمیل کیا اب بالکل بھی میری ذات پر  
برہنہ نہیں رہا جنہیں جو اس طرح سزا دینا چاہتی

”ریمیل اور ریمیل بنی کہاں ہو تم اور یہ  
ہاڑی سس کی کھڑی ہے باہر۔“ اس وقت رشیدان  
ہاڑی کی آواز آئی تو فوراً اٹھ کر باہر آئی وہ دونوں  
تھوں میں شاعر تھامے ہوئے تھیں۔

”اے ریمیل بچی کون آیا ہے گاڑی پر کیا  
سلی آئی ہے۔“ وہ اسے دیکھ کر دوبارہ سوالات  
دہرانے لگیں۔

”نہیں خالہ ان کے بیٹے ہیں یہ۔“ اتنے  
میں وہ بھی باہر چلا آیا تھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ  
ہوئیں تو اس نے فوراً سلام کیا۔

”ماشا اللہ ماشا اللہ جیتا رہ، کیسا گھبرو جوان  
بیٹا ہے سلی کا۔“ وہ وہیں چار پائی پر بیٹھ گئیں۔  
”حق ہاں قسمت اپنی اپنی۔“

”اب دیکھو باب کی لاج رکھنے والی انہیں  
گیموں میں ڈل گئی اور گھر سے بھاگ کر۔۔۔۔۔۔  
ایک دم گڑ بڑا گئی۔“

”وہ خالہ پانی پلاؤں آپ کو اور یہ کیا کچھ  
اٹھالائیں آپ۔“

”ارے ہاں پتر یہ تو سبزی ہے بڑی مہنگی  
دی ہے چور کی اولاد نے اور یہ سمو سے لائی ہوں  
تیرے لئے وہاں ریڑھی والا کھڑا گرم گرم نکال  
رہا تھا میں نے سوچا میری ریمیل بچی کو بہت پسند  
ہیں چلو لئے چلتی ہوں۔“

”بہت اچھا کیا خالہ آپ نے۔“ اس نے  
کہا اور ریمیل پر رکھے جگ میں سے پانی ڈال کر  
ان کی طرف بڑھایا۔ وہ اس کی اس دانستہ کوشش  
پر اسے مشکور نگاہوں سے دیکھ کر رہ گیا۔

”اچھا پتر پھر میں چلتی ہوں پہلے ہی بڑی  
دیر ہوگئی ہے بازار میں۔“

”ٹھیک ہے خالہ آپ کا بہت بہت  
شکر ہے۔“ اس نے ٹکٹا بھی انہیں نہ روکا تھا۔ ان  
کے جانے کے بعد شاپر رکھ کر پلٹی تو بچن کے دروازے میں  
گئی تو وہ پورے گھر کا جائزہ لینے لگا۔ وہ آج  
یہاں تیسری بار آیا تھا۔ پہلی بار وہ ان لوگوں کو  
کھوجتا ہوا یہاں آیا تھا دوسری بار اسے برستی بارش  
سے بچا کر لایا تھا اور اس نے اس کی خوب عزت  
انسانی کے بعد رخصت کیا بلکہ رخصت ہونے پر  
مجبور کیا تھا اور آج وہ خود بخود مجبور ہو کر چلا آیا  
تھا۔

وہ شاپر رکھ کر پلٹی تو بچن کے دروازے میں  
ایستادہ تھا۔ وہ پلیٹ کر گہری سانس لیتی ہوئی چولہا  
جلانے لگی اور چائے کا مانی رکھ کر برتن نکالے۔  
”تمہارا دم نہیں گھٹتا اس چھوٹے سے گھر  
میں۔“ وہ اس کے ہاتھوں کی حرکت کو دیکھتے  
ہوئے بولا۔

”نہیں ایسا تو کچھ نہیں ہوتا۔“  
”کیوں کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارا  
بھی کیا بہت بڑا گھر ہو نوکر چاکر ہوں۔ تم اس  
گھر کو اپنے ہاتھوں سے سجاؤ سنو ارد۔“ اس نے  
اس کی اس کھوج پر اس کی طرف دیکھا اور پھر  
اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ اب ولیمکٹ کا پکٹ  
کھول کر پلیٹ میں رکھ رہی تھی۔  
”جی نہیں مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں  
ہے۔“ اس کا انداز قطعی تھا۔

”یہ گھر اس گھر کی چار دیواری مجھے بے حد  
عزیز ہے، اس گھر نے ہمیں اس وقت پناہ دی  
جب کہیں اور کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ میں اسی گھر  
میں آنکھ کھولی۔ انہی گلیوں میں کھیل کر بڑی  
ہوئی، انہی گلیوں میں رہنے والوں نے ہر مشکل  
وقت میں ہمارا ساتھ دیا۔ ہمیں اس گھر نے ہر  
اچھے برے وقت سے محفوظ رکھا موسموں کی شدت  
سے بچایا، تو پھر کیوں ہوگی مجھے یہاں ٹھن۔“



اس دوران اس نے پلیٹ میں نہکو ڈالی سمو سے نکال کر پلیٹ نکال کر رکھے ایک دوسرے کیبٹ سے فروٹ ایک نکال کر پلیٹ میں سجایا۔ وہ بہت نفاس سے ہر چیز جاری تھی۔ وہ اس کے کام کرنے کے سلیقے کو دل ہی دل میں سراہے بنانہ رہ سکا۔ وہ اب جائے تھرمس میں ڈال رہی تھی۔  
 ”لیکن ابھی بھی تو انسان کا دل چاہتا ہے ناں کہ اس کے پاس بہت سارا روپیہ ہو جس سے وہ اپنی ہر ادھوری خواہش کو پورا کر سکے ہر شوق کی تکمیل ہو جائے۔“

وہ رضیہ جنید کا رویہ مد نظر رکھتے ہوئے اسے بہت گہرائی سے جانچ رہا تھا۔  
 ”پیسہ میرا شوق نہیں ضرورت ہے تن ڈھانپنے کو کپڑا اور عزت سے دو وقت کی روٹی۔“  
 ”ہاہ عزت۔ ہر روز دھکے کھانا دن رات جتے رہنا اور پھر تنخواہ کے انتظار میں رہنا کہ کب ملے اور کب دو وقت کی روٹی عزت سے ملے۔“  
 ”احزم صاحب محنت میں کوئی حار نہیں بھیک نہیں مانگی کسی سے محنت کرتی ہوں۔“  
 ”کیا آپ ایسا نہیں کرتے کیا آپ اپنے کسٹمز کے پیچھے نہیں بھاگتے ڈیننگ کے بعد رٹم کی ادائیگی کے لئے کون کون سے پاڑ بیلنا پڑتے ہیں یہ میں بھی اچھی طرح جانتی ہوں اور آپ بھی۔“

”لیکن مردوں کا تو کام ہی یہی ہوتا ہے جب کہ عورت کا کام تو گھر سنبھالنا اور شوہر کے دل پر راج کرنا ہوتا ہے۔“ وہ جو کہ اب تک بہت سنجیدگی سے بات کر رہا تھا آخر میں اس کا لہجہ کچھ مسکراتا ہوا معنی خیز ہو گیا۔ اس کی بات پر اس نے جلتا چولہا بہت زور سے بند کیا۔ وہ ٹرے تھامے آگے بڑھی تو اس نے رستہ دیا۔ اس نے برآمدے میں ہی ٹیبل پر ٹرے رکھی اور تھرمس میں جانے لگا۔ اس کی طرف بڑھائی۔

”آپ چائے پیچھے میں ابھی آتی ہوں۔“  
 کپ تھماتے اس نے کہا تو وہ کپ تھام کر اس کی راہ میں حائل ہو گیا جانتا تھا کہ وہ اپنا تمام خوبصورتیوں کو جلد از جلد سمیٹ لینا چاہتی ہے۔  
 ”بیٹھ جاؤ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ وہ کوئی بس نہ چلتے دیکھ کر دھیرے دھیرے چلتی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ اسے تھمایا اور اپنے لئے اور ڈال کر کرسی پر بیٹھ گیا۔  
 ”آج لگتا ہے سچ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ اس نے باری باری سب چیزیں سمجھتے ہوئے کہا۔

”لو تمہیں سمو سے بہت پسند ہیں۔“ اس نے سموں کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی جسے لے کر وہ ذرا ذرا چھنے کے انداز میں کھانے لگی۔  
 گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے وہ اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا چہرے پر سوچ کے آثار بہت واضح تھے جیسے وہ بات کرنے کا سرا تلاش کر رہا ہو اسے تو سرائیہ ملا البتہ باہر رکشہ رکنے کی آواز پر وہ ضرور چونک اٹھی تھی۔  
 ”لگتا ہے اماں آگئیں ہیں۔“ اس نے کپ رکھا۔ اتنے میں وہ لوگ اندر آ گئیں۔  
 ”ارے میرا شہزادہ آ گیا۔“ اس نے فوراً راہ فرار اختیار کی اور بھانجے کو گود میں بھر کر بے تابی سے اس کے گال کو چوموا وہ پیار کی اس شدت پر احتجاجاً روئے لگا۔  
 ”ارے بیٹا تم کب آئے۔“ ان کے درمیان رسمی گفتگو جاری تھی کہ وہ روتے ہوئے ارحم کو آپنی کوتھما کر اندر چلی گئی۔

”اور سناؤ کیسے ہوا یا کیسی ہیں؟“  
 ”بالکل ٹھیک ہوں آپ سنا میں آپ کیسے ہیں۔“  
 ”فائن، اچھا“ مجھے اجازت دیں



”تو قونی مت کرو، وقت ہاتھ سے پس گیا  
لے آئی۔“ اور پھر نکال کر دروازہ بند کر دیا اور  
اماں کے پاس آکر سلی آمیز ہاتھ ان کے ہاتھ پر  
رکھا۔

”اماں آپ دعا کریں بس۔“

اس نے فرنیٹ ڈور کھولا تو وہ حذب سی  
بیٹھ گئی۔ وہ خاموشی سے گاڑی کو روڈ پر لے آیا۔  
ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر ٹیپ کا بٹن پیش کیا تو کاری  
مجدد فضا میں مدھر موسیقی بول اُٹھی۔ وہ اب تک  
بالکل خاموش تھا۔ جب کہ گاڑی اپنی سبک رفتار  
سے سڑکوں پر رواں دواں ٹریک میں سے جبکہ  
بنانی ہوئی ایک انجانے سفر کی طرف گامزن تھی۔  
کافی دیر گزرنے کے بعد بھی اس کی چپ نہ ٹوٹی  
تو اسے بولنا پڑا۔

”کیا بات کرنی ہے آپ کو، اور یہ کہاں  
لے جا رہے ہیں مجھے۔“ اب رہا کون پرش نہ ہونے  
کے برابر تھا۔ وہ شاید کافی دور نکل آئے تھے۔

”اُٹھو کر رہا ہوں تمہیں۔“ اس نے طنز یہ کہا  
تو لب بھینچ کر خاموش ہو گئی۔ کچھ بھی پوچھنے کے  
ارادے کو ترک کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر  
دیکھنے لگی۔ خوبصورت گیت خود بخود اسے اپنی  
طرف متوجہ کر گئے تھے وہ اس کی چوٹس پر دل ہی  
دل میں داد دیئے بنانہ رہ سکی۔ مزید آدھے بجے  
کی ڈرائیو انہیں دریا کے کنارے لے آئی تھی۔  
اس نے ایک سائیڈ پر گاڑی پارک کی تو وہ فرنیٹ  
ڈور کھول کر اس سے پہلے باہر نکل آئی۔ دریا کی  
گیلی ریت کی ٹھنڈک کو محسوس کرنے کے لئے  
اس چپل جو کہ وہ افراتفری میں بدل بھی نہ سکی  
تھی۔ وہیں اتار دیئے۔ دھیمے سروں میں چلتی  
ٹھنڈی مہمیز ہوا اس کا آپٹل اڑانے لگی۔  
دھیرے دھیرے چلتی پانی کے قریب آ گئی اور  
گہری سانس بھر کر فضا کی تازگی کو اپنے اندر

”ارے ارے اجزم بھائی یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم  
”ارے ارے“ جارہے ہیں۔

”میں تو اپنے اس بھانجے سے ملنے آیا تھا  
مجرم خود ہی سیر سپاٹوں پر نکلے ہوئے  
تھا۔“ اس نے کہا۔ وہ اس کی سیر کی وجہ بتانے  
نے اپنا والٹ نکالا۔

”ابھی میں تو اس کے لئے شاپنگ کرنا  
چاہتا تھا لیکن بچوں کی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں  
مجھے لہذا لو۔“ بھئی ننھے مہمان یہ تمہاری منہ  
کھائی ہے۔“ اس نے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ  
کی طرف بڑھائے۔

”ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”خاموش رہو ماموں بھانجے کے معاملے  
میں مداخلت نہیں کرو تم۔“ اس نے ایک دم ہی  
گت کی دیوار گرا دی۔

”کیو بھی دوست۔“ اس نے اسے انگلی  
سے چھیڑا تو اس نے انگلی کو ہاتھ کی مٹھی میں بھر  
لی۔ اس کی ایسی معصوم شرارت پر مسکرا دیا اور پھر  
گناہ کھنکھار کر اماں کی طرف دیکھا۔

”آنٹی اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ریمیل  
کو کچھ دیر کے لئے باہر لے جاؤں۔“ اس کے  
سوال پر وہ بری طرح چونکی تھیں۔

”آں۔“ باہر آئی ریمیل ٹھٹھک کر وہیں  
رک گئی۔ انہوں نے راحیلہ کی طرف دیکھا جس  
کی نظریں پر زور حمایت کر رہی تھیں۔

”ہاں ہاں آں آں، ٹھہ۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے لے  
جاؤ۔“ شاید انہیں بھی مسئلے کا یہی حل نظر آیا تھا۔  
اس نے تینوں نفوس پر نظر ڈالی اور قدم باہر کی  
چانب بڑھا دیئے۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی  
تھی۔ راحیلہ نے جا کر پیچھے سے دھکا دیا۔

”کیا یہی کھڑی رہو گی جاؤ اب۔“

”میں آپی میں۔“



اتار۔ گاڑی کو لاک کر کے قدم بہ قدم چلتی ریمیل کو چند لمحے وہیں کھڑے کھڑے دیکھا اور پھر خود بھی اس کے نقش پا پر چلتا ہوا بین اس کی پشت پر آن رکا۔

سورج کی روشنی میں جھلملاتا پانی ہیروں کی مانند نظر آتا تھا اور اس میں ہچکولے جیتی کشتیاں کھلونوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ وہ منظر کی خوبصورتی میں پوری طرح گم تھی۔ اس نے اس کے لپٹے ہوئے بالوں میں لگے چھوٹے سے کچر کو ہاتھ بڑھا کر بہت آہستگی سے اٹار کر پینٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس کے ریشمی بالوں نے ایک لمحہ ہی نہ لگایا تھا بکھرنے میں۔ وہ چونکی اور گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ بالکل بے نیاز بنا دور تک پھلے یانیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پلٹ کر خاموشی سے چلنے لگی اڑتے بالوں کو آچل میں چھپانے کی کوشش کی لیکن ناکامی کی صوت میں یہ کوشش ترک کرتے ہوئے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ ایک قدم بڑھا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔ اس کے اڑتے ہوئے ریشمی بال اس کے چہرے سے لکرا رہے تھے جنہیں وہ بالکل بھی ہٹانا نہیں چاہتا تھا۔ خاموشی اب بھی دونوں کے درمیان حا مل تھی لیکن اب اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ ”کیوں لائے ہیں آپ مجھے یہاں۔“ اس اچانک ہی ایک خوبصورت مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کی تراش میں سج گئی۔

”اس لئے کہ تمہاری ہمراہی میں تھوڑا سا وقت گزارنا چاہتا تھا۔“ اس کے جواب پر ایک تسخرانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر در آئی۔

”جی ہاں جانتی ہوں کہ آپ میری ہمراہی میں تھوڑا سا ”وقت“ ہی گزارنا چاہتے ہیں۔“ اس لفظ وقت پر زور دیتے ہوئے کہا تو اس کی خوبصورت مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی غصے اور برادشت کی شدت سے اس کی رکیں تن لگیں۔

”شٹ اپ۔“ وہ مٹھیاں بچھ کر سر نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پھنکارا، لیکن اس کے بدستور استہزائیہ انداز پر اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

”آئی سوری ریمیل آئی ایم ایک شریعی سوری تم ابھی تک ناراض ہو مجھ سے۔“

”دیکھو میں بہت شرمندہ ہوں تم نہیں جانتی کہ میں نے یہ دن کیسے گزارے ہیں۔ آئی ایم ویری سوری۔“ اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر سامنے کیا تو اس نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

”کس بات کی سوری کر رہے ہیں آپ۔“ ہونہ، مجھے معلوم ہے کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ تو مردکی فطرت میں شامل ہے، جو ہمیشہ موع کی تلاش میں رہتا ہے جہاں عورت ذرا کمزور پڑی وہیں.....“

”فار گاڈ سیک ریمیل! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔“ وہ اس الزام پر کراہ اٹھا۔

”جو کچھ بھی ہوا میں جان بوجھ کر نہیں کیا تھا میں اس وقت اپنے اختیار میں نہیں تھا نجانے کیوں میں.....، اپنی دے میں مانتا ہوں کہ جو ہوا صحیح نہیں تھا، لیکن نا جائز تو کچھ نہیں کیا میں نے تم میری منکو جہ ہو اور شاید اسی تعلق کی بنا پر.....“

”او نہ منکو جہ، تعلق۔“ وہ مڑ کر چلنے لگی۔

”کیا آپ تسلیم کرتے ہیں اس تعلق کو؟“ اس کے سوال پر وہ تڑپ اٹھا اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکے سے اپنی طرف موڑا۔

”کیا ابھی بھی تمہیں میرے کسی اقرار کی ضرورت ہے؟“

”کیا ابھی بھی تم نہیں جانتی کہ کیا چاہتا ہوں میں؟“ اس کی کلائی کو سختی سے دبوچے اس کی آنکھوں میں دیکھتا سرد سے لہجے میں سوال کر رہا تھا۔ اس کا شانہ اس کے سینے سے لگا تھا اور



اندازہ نہیں کہ کتنا چاہتا ہوں میں تمہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کتنی محبت میں تم سے کرتا ہوں اس سے کئی گنا زیادہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اس کی بھیگی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جذب سے بول رہا تھا۔ لیکن اس کے آخری الفاظ پر وہ نظریں چلا گئی۔

”اونہ، نظریں مت چراؤ ادھر دیکھو میری طرف اور جواب دو میری بات کا کہ یہی سچ ہے ناں۔“ اس کی خوبیت سے فائدہ اٹھا کر اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑانے چاہے۔

”اونہ، ایسے نہیں۔ بہت روکنے کے باوجود بھی اس کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ در آئی تو ساتھ ہی جھکی پلکیں لرز گئیں۔ اتنے سالوں میں آج پہلی بار اسے مسکراتے دیکھا تو دیوانہ وار دیکھے گیا۔

”جانتی ہو میں تمہیں یہاں کیوں لایا تھا۔“ اس نے لفظ یہاں پر زور دیا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اس لئے کہ تنہائی میں، میں کہیں پھر خود سے اختیار نہ کھودوں۔“ اس نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ لوؤں تک سرخ ہو گئی۔

”دیکھو پلیز بندے کو اس طرح قتل مت کرو ورنہ صبح اخبار میں خبر آئے گی کہ ایک شوہر اپنی منکوحہ کی مسکراہٹ پر جان دے بیٹھا۔“ اس نے اتنے ہی انداز میں کہا کہ وہ اپنی بھرپور ہنسی کو نہ روک سکی اور اسے یوں ہنستا ہوا دیکھ کر احرام کے ارد گرد خوشیوں کے جگنو چمکنے لگے۔

☆☆☆

کی تیز تیز چلتی سانسیں اس کے چہرے سے گر رہی تھیں۔ اس نے چہرہ موڑ کر آنکھیں سے ہلکی ہلکی آنسوؤں کی گہائی اس کی گرفت سے چھڑائی اور آنکھوں سے آنسو آنے والی نمی کو جھپک جھپک کر اندر ہارنے لگی۔

”ریمل پلیز میں تمہارا رویہ نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ آخر تم اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتیں کیا چاہتی ہو تم۔“

”کیا کر رہی ہوں میں کیا چاہتے ہیں آپ؟“ اس نے کہا۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ہڑا کر بھیک مانگوں آپ سے۔“ وہ اچانک پھٹ پڑی۔

”اپنی ماں کی طرح آپ کے قدموں پر کر اس تعلق کو جوڑے رکھنے کی فریاد کروں۔“ اس نے کہا۔ میں نے ایک بھکارن ماں کی لاج سے ہونے ترس، ہمدردی اور رحمہاں کی بنیاد پر کیا تھا۔“

”ہاں بتائیں کیا کروں کیا چاہتے ہیں آپ؟“ اس نے کہا۔ میں نے یہ سب سیکھ کر دیکھا تھا۔

”اس کے قریب بیٹھ کر اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لے دوسرے ہاتھ کی انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو چھو لیا۔ چند لمحے اس کے بھیگے چہرے کو دیکھتا اور پھر بہت سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”کس طرح دور ہو گا تمہارا احساس کمتری، تو بار بار کوشش کر چکا ہوں تمہارے قریب آنے اور یہ دوریاں مٹانے کی، لیکن تم نے جس خودداری اور کھوکھلی انا کے خول میں خود کو بند کر رکھا ہے نا وہ مجھے ناکام بناتی رہی ہے۔“

”کچھ نہیں چاہتا میں سوائے تمہارے، بہت محبت کرتا ہوں میں تم سے اتنی کہ مجھے خود بھی